ISSN 0974-7346

اپریل ۲۰۲۶ء

جلد۲۱۳ــــعدد ۴

معارف

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان میں	:	سالانہ ۴۰۰/روپے۔ فی شمارہ ۴۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۱۰۰۰/روپے
		ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۸۰۰/روپے میں دستیاب ہے۔
		ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰/روپے ہے۔
دیگر ممالک میں	:	سادہ ڈاک ۱۷۳۰/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰/روپے

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ای میل (ساری دنیا میں) ۴۰۰/روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کر کے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC : PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

● زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔ ● معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔ ● خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ ● معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ ● کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے تصنیفی اور نشریاتی کام میں مدد کے لیے اس اکاؤنٹ پر تعاون کریں:

بینک کا نام: Punjab National Bank
اکاؤنٹ نمبر: 4761005500000051
آئی ایف ایس سی: PUNB0476100

تعاون بھیجنے کے بعد تفصیلات سے ہم کو اس ایمیل پر مطلع کریں:
info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی CSR کے تحت رجسٹرڈ ہے۔اب بڑی تجارتی کمپنیاں براہ راست دارالمصنّفین کو CSR کے تحت عطیات دے سکتی ہیں۔

نوٹ: غیر ممالک سے تعاون بھیجنے کے لیے بینک کی تفصیلات ایمیل بھیج کر حاصل کریں۔

Ma'arif Section: 06386324437
Email: info@shibliacademy.org website: www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۳ ماہ شوال المعظم ۱۴۴۷ھ مطابق ماہ اپریل ۲۰۲۶ء عدد ۴

مجلس ادارت
مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی
پروفیسر شریف حسین قاسمی
پروفیسر اشتیاق احمد ظلی
ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی
ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

مرتبہ
ڈاکٹر ظفر الاسلام خان
محمد عمیر الصدیق ندوی
کلیم صفات اصلاحی

ادارتی سیکریٹری:
ڈاکٹر کمال اختر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر:۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات — محمد عمیر الصدیق ندوی — ۴

مقالات

مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلیمی افکار و نظریات — ڈاکٹر علی محمد بٹ — ۷

جنوبی ہند کی زبانوں کے فروغ میں مسلمانوں کا تعاون — ڈاکٹر راہی فدائی — ۲۱

رواداری اور امن کے قیام میں بنگال کے مسلم سلاطین کا کردار — ڈاکٹر کمال اشرف — ۲۸

منظومات شبلی کی ضبطی — ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی — ۴۱

الطاف حسین حالی کی کتاب "اصولِ فارسی" — ڈاکٹر مہتاب جہاں — ۵۲

شہادت مسجد کانپور ۱۹۱۳ء سے بلڈوزر کی سیاست تک — محمد علم اللہ — ۵۹

تبصرۂ کتب — ع۔ ص، ک۔ ص اصلاحی، ف۔ اصلاحی — ۷۰

ادبیات

غزل — ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی — ۷۹

معارف کی ڈاک — سلیم منصور خالد — ۸۰

رسید کتب موصولہ — ۸۲

شذرات

رمضان المبارک یعنی شہر قرآن کے ایام معدودات کی بہاریں آئیں اور رخصت بھی ہوئیں لیکن دنیا کے آسمان پر ہلال رمضان سے غرہ شوال تک شفق کی سرخی ہی لہو رنگ میں ڈوبتی نظر آئی۔ عید اصلاً الٰہی انعامات کی تقسیم اور ربانی بخششوں کی بارش کا نام ہے جس کے چاند کو روزہ دار کی نگاہ کا نور کہا گیا، جس کی دید کے لیے ایک مسلم کو سراپا انتظار بتایا گیا۔ یہ سطریں بھی عین اس وقت تحریر کے حوالے ہو رہی ہیں جب ہلال عید کی پیشانی پر پیام عید کی تحریر روشن ہو کر نمودار ہو رہی ہے لیکن اس بار حالت یہ ہے کہ جو شام کبھی صبح عیش کی تمہید ہوتی تھی، وہ بموں، میزائیلوں، خونی دھماکوں اور انسانی کرب وبلا کی چیخوں اور آہوں میں بدل گئی۔ طاغوت وجبروت کی سرکشی اور خون آشامی کی ہوس نے غزہ کے بعد امن وامانِ ایران کو فغانِ ایران میں بدل دینے کا وہ عمل شروع کیا جس نے صرف شرق اوسط کے ملکوں اور ریاستوں کو پامال ہی نہیں کیا، دنیا کے امن وسکون کو بدحال کر دیا۔ آج تمام عالم استعماری اور صہیونی جرائم کی دو سب سے زیادہ مرتکب حکومتوں اسرائیل اور امریکہ کے تکبر اور ناعاقبت اندیشی کے نتائج بد سے دوچار ہے۔

***

اخبارات اور ذرائع اعلام وابلاغ عالمی پیمانے پر اس جنگ کے تعلق سے جس طرح اپنے معلومات وتاثرات اور خدشوں اور اندیشوں کا اظہار کر رہے ہیں، اس کو ایک محشر کا منظر کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اصل گریہ ساماں تو وہ ہیں جن کے دل میں بقول شاعر حق بیاں، طوفانِ اشک ہے۔ جن کی شبوں کے لہو سے ان کی صبح رنگین ہوتی جاتی ہے۔ رمضان کے خیر وبرکت والے رات دن جن کی پہچان دشواریوں سے دوری اور آسانیوں کی نزدیکی سے کی گئی ہو، ان دنوں میں قتل وخون ریزی ایسی کہ غیروں اور اپنوں کے فرق کا احساس بھی اوجھل ہو جائے۔ اس کی وجہ بلکہ جواز کی سبیلیں خواہ کیسی بھی تلاش اور بیان کی جائیں، لیکن خدا کے سادہ دل بندے کیا واقعی محض مجبور تماشا ہی ہیں۔ مجبور تماشا ضروری نہیں کہ محروم تماشا بھی ہوں۔ غزہ کی بربادی نے اسرائیلی اور استعماری ارادوں کو مخفی نہیں رکھا۔ معارف کو عالمی سیاست کے رنگ و آہنگ کی نزاکتوں اور باریکیوں سے اس باخبری کا دعویٰ نہیں جو اہل سیاست اور اہل صحافت کی زبانوں پر جاری رہتا ہے۔ ہاں اس کو یقین ضرور ہے کہ انسانوں کی سرشت میں فساد اور سفک دماء کی آمیزش بہرحال ہے اور یہ حق وباطل

کے امتیاز اور خیر و شر کے اختیار کے لیے ہے۔ ازل سے تا امروز حق و باطل کی یہ ستیزہ کاری جاری ہے اور دنیا کے یوم آخر تک جاری رہے گی۔ قریب ایک سال پہلے معارف نے سفاکی اور خوں ریزی کے ایک رزمیہ کو جنگ نامہ ایران کی شکل میں دیکھا تھا اور لکھا تھا کہ شرق اوسط میں ایک صدی سے زیادہ کی مدت سے اور اولادِ آدمؑ کی سب سے نافرمان قوم اور اپنی مسلسل نافرمانی کی وجہ سے ذلیل و خوار قوم نے مکر و فریب کی بنیاد پر قوت اور اقتدار اور سرمایہ و استعمار کے نشے کو اپنی لت میں بدل دیا ہے، اس کا ایک نمونہ غزہ کی صورت میں تمام دنیا نے دیکھا اور انہوں نے بھی دیکھا جن کے لیے حق تھا کہ تاب دید ان میں ہوتی ہی نہیں، خصوصاً ان کو جن کا فلسطینیوں سے خون و خاک کا رشتہ سب سے قریب اور سب سے عزیز تھا۔ دنیاوی مصلحتوں کی دھند غیرت و حمیت اور ذہن و ضمیر پر اس طرح چھائی کہ مستقبل کے نوشتوں کو پڑھا ہی نہیں جا سکا۔ ایسے میں نسبتاً زیادہ مضبوط اور غارت گروں کی نظر میں زیادہ خطرناک ایران کا خطہ تھا۔ وقت کے چنگیزوں نے ایران کو ویران بنانے کی مہم تیز تر کر دی۔ معارف نے لکھا تھا کہ ایران کی ایٹمی تنصیبات کی تباہی یا نئے حکمرانوں کی تقرری یا دوسرے لفظوں میں صہیونی فتنہ سامانی کی توسیع اسی مہم کے انجام کی پیشین گوئیاں ہیں۔ قریب ایک سال پہلے یہ اندیشے ایران پر اسرائیلی و امریکی حملوں اور وہاں کی مقتدر ترین شخصیتوں اور بے قصور عوام کی زندگی کے خاتمہ کی شکل میں سچ ثابت ہوئے۔ اس وقت ۱۹۱۳ء میں شائع ہونے والی ایک کتاب فغان ایران کا ذکر بھی اسی سلسلہ حادثات روز و شب کے ضمن میں آیا تھا۔ اس کتاب میں روسیوں سے ایرانیوں کی جنگ کا ذکر ہے، عجب اتفاق ہے کہ یہ جنگ ٹھیک دو سو سال پہلے ۱۸۲۶ء میں ہوئی تھی۔ کسی مسٹر واٹسن مصنف تاریخ ایران نے لکھا تھا کہ گنجہ کی اس جنگ میں اگرچہ ایرانیوں نے روسیوں سے شکست کھائی لیکن یہ بھی ثابت کیا کہ دنیا میں کوئی فوج اتنی محنت اور جفاکش نہیں۔ یہ بھی لکھا کہ دنیا کی کوئی فوج تحمل میں ایرانی فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہ اپنے ملک کو ہر حملہ آور کے مقابلے میں بآسانی بچا سکے گی بشرطیکہ وہ فوج باقاعدہ قواعد دان ہو۔ اس وقت کے مورخ نے لکھا تھا کہ روس اور چند یوروپی سلطنتیں مدت سے جوع الارض کے مرض میں مبتلا ہیں، آج دو سو سال بعد بھی وہی کیفیت ہے بس اس مرض میں یورپ کے ساتھ اب امریکہ بھی شامل ہے۔

***

ایران کی خوبصورتی، اس کے موسموں کی مناسبت سے مزاجوں میں اعتدال کی خوبی اور سب سے بڑھ کر اس کی جغرافیائی اہمیت اور بحری و بری گزرگاہوں کے نہایت اہم محل وقوع کا ذکر ہوتا رہا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام کا ابر کرم جب اس خطہ پر برسا تو اس کی اہمیت کا صحیح ادراک ایک عالم کو ہوا۔ ہماری فکر کا اصل سبب یہی رشتہ ہے۔ عرب و عجم کی تفریق کا جواز اسلام کے حوالے سے تلاش ہی نہیں کیا جاسکتا۔ معاملہ ظلم اور جبر اور تکبر اور غرور کا ہے، جو اس کا مرتکب وہ مجرم ہے، جو اس کا شکار وہ ہمدردی اور تعاون کا مستحق۔ جولائی ۲۰۲۵ء کے شذرات میں کہا گیا تھا کہ مذہب، مسلک، حکومت، شخصیت خدا جانے کتنے آئینوں میں حالات کو دیکھا اور دکھایا جارہا ہے۔ یہ اہل سیاست اور کسی حد تک موجودہ اہل صحافت کا کام ہے مگر جن کے ذہنوں اور دلوں میں دعوت و عزیمت کی داستانیں زندہ ہیں اور جن کا وجود حق و انصاف اور سارے جہانوں کے لیے رحمت کی نعمت کے طور پر ہے اور جن کے لیے جنس، رنگ، علاقہ اور زبان و تہذیب کی تفریق کی جگہ صرف ایک رب اور ایک ہی منزل کو مقصود بنانا اور پیش نظر رکھنا ہے ان کے لیے معیار صرف حق کی کامیابی ہے۔ حق کی تلاش ہی صداقت کی یافت کی ضامن ہے۔ یہ صداقت کیا ہے، انسانیت کی تکریم اور آدمیت کی حرمت اور جس سرچشمہ خیر و احسان سے یہ فیضان عام ہوا۔ اس کے عرفان سے سربلندی اور آخری اور فیصلہ کن کامیابی اسی سرچشمہ ایمان و اعتقاد کے لیے مقدر ہے۔

***

بات ہلال رمضان اور غرہ شوال سے شروع ہوئی تھی۔ اقبال نے خدا جانے کس عالم میں اس چاند سے بات کی تھی، بات کیا تھی ایک درخواست تھی کہ اے چاند اوج گردوں سے دنیا کی بستی دیکھ لے اور اپنی رفعت سے ہماری پستی کا بھی نظارہ کر لے۔ فرقہ آرائی کی زنجیروں میں اسیر مسلمانوں کو دیکھ کر اپنی آزادی اور ان کی گرفتاری کا منظر بھی سامنے ہو۔ یہی نہیں آبرو والوں کے طرز تملق پر بھی نظر کر لے جو ان کے لیے ہے، جن کی کوئی آبرو نہیں اور یہ شعر تو واقعی صدائے غیب کا ترجمان بن گیا کہ:

ساز عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں میں سن
اور ایراں میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ

موجودہ رزمیہ میں اختتام کا مصرعہ کیا ہوگا خدا جانے لیکن اقبال سے یہاں بھی مدد لی جاسکتی ہے کہ:

شام غم لیکن خبر دیتی ہے صبح عید کی
ظلمت شب میں نظر آئی کرن امید کی

***

مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلیمی افکار و نظریات

ڈاکٹر علی محمد بٹ
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، اونتی پورہ کشمیر
alimohammad@iust.ac.in

مولانا ابوالکلام آزاد اور اُن کے تعلیمی افکار پر گفتگو ایک اہم اور تحقیق طلب موضوع ہے، کیونکہ مولانا آزاد نہ صرف ایک عظیم مفکر، عالمِ دین، اور آزادی کے رہنما تھے بلکہ بھارت کے پہلے وزیرِ تعلیم بھی تھے۔ اُن کی تعلیمی بصارت آج بھی ہندوستانی تعلیمی نظام پر گہرے نقوش واثرات روزِروشن کی طرح عیاں ہے۔ مولانا آزاد کا سب سے اہم نظریہ یہ تھا کہ تعلیم ہر شہری کا بنیادی حق ہے، چاہے وہ کسی بھی مذہب، ذات، یا طبقے سے تعلق رکھتا ہو۔ وہ چاہتے تھے کہ تعلیم ہر عام وخاص تک پہنچے، خاص طور پر پسماندہ طبقات اور خواتین تک تاکہ وہ اپنے مستقبل کا صحیح تعین کرسکیں۔ اگرچہ وہ خود مذہبی عالم تھے، لیکن اُن کی تعلیمی بصارت سیکولر عوامل کی حامل تھی۔ ان کا خیال تھا کہ تعلیم مذہبی تعصب سے پاک ہونی چاہیے اور سائنسی، فکری اور ادبی علوم کو فروغ دینا لازمی ہے تاکہ قومی ترقی عروج کو چھوسکے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ تعلیم صرف معلومات کا نام نہیں بلکہ کردار سازی کا ذریعہ ہے۔ اس لئے تعلیمی نظام کو قومی ہم آہنگی، بھائی چارے اور جمہوری اقدار کے فروغ کے لئے استعمال کرنا چاہئے۔ مذہب اور جدیدیت کے درمیان ہم آہنگی پیدا کی جائے تاکہ تاریخی اقدار کو قومی پائیدان کے لئے استعمال کیا جائے۔ اِن افکار کو اُجاگر کرنا وقت کی اشد ضرورت ہے تاکہ عصر حاضر میں جو قومی رجحان اُبھر کر سامنے آرہا ہے وہ یک طرفہ، فرقہ وارانہ اور تعصب کا شکار ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک ایسی عبقری ہستی تھے جنہوں نے اپنے علم، بصیرت اور جدوجہد سے تاریخ میں انمٹ نقوش چھوڑے۔ تحریکِ آزادی سے لے کر قومی و دینی قیادت کے ہر میدان

میں انہوں نے اپنی منفرد پہچان قائم کی۔ علمی و ادبی حلقوں میں ان کا مقام آسمان پر چمکتے ہوئے ایک تابندہ ستارے جیسا ہے، جس کی روشنی نے کئی نسلوں کے اذہان کو منور کیا۔ اگرچہ انہوں نے رسمی تعلیم پر کوئی مستقل تصنیف تحریر نہیں کی، تاہم اردو، ہندی، عربی اور فارسی زبانوں پر ان کی گرفت حیران کن حد تک مضبوط تھی۔ وہ ریاضی، عالمی تاریخ، فلسفہ اور سائنس جیسے مضامین میں گہری بصیرت رکھتے تھے۔ دینی معاملات میں ان کی فہم اتنی عمیق تھی کہ جید علما بھی ان سے رہنمائی لینے میں فخر محسوس کرتے تھے[۱]۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی فکری تشکیل کے ابتدائی مراحل میں مشہور مراکشی مفکر، مؤرخ اور سیاح ابن خلدون (م:۱۴۰۶ء) کا گہرا اثر نمایاں ہے۔ ابن خلدون کے نظریات نے مولانا کو روایتی تدریسی انداز اور مروجہ نصاب پر تنقیدی نظر ڈالنے کی ترغیب دی۔ مولانا آزاد کے نزدیک تعلیم ہی وہ بنیادی وسیلہ ہے جو مذہبی اور دنیاوی نظامِ تعلیم میں موجود جمود، تعصب اور خامیوں کا ازالہ کر سکتا ہے۔ وہ سر سید احمد خان کے افکار سے بھی متاثر تھے، جنہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کو جدید سائنسی تعلیم کی طرف راغب کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ مولانا آزاد ان علما پر تنقید کرتے تھے جو مسلمانوں کو ہر اُس چیز سے گریز کا مشورہ دیتے تھے جو کسی بھی طور پر انگریزوں سے منسلک ہو، چاہے وہ علم و دانش ہی کیوں نہ ہو۔ اگرچہ مولانا استعماری حکومت کے سخت مخالف تھے، لیکن وہ مغرب کے تعلیمی ڈھانچے، خاص طور پر اس کی سائنسی بنیادوں سے بے حد متاثر تھے اور اس میں موجود مثبت پہلوؤں کو اپنانے کے حامی تھے[۲]۔

وطن عزیز کی آزادی کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک دہائی تک وزارتِ تعلیم کی قیادت

---

[۱] مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا ابوالکلام آزاد: سیرت و شخصیت اور علمی اور عملی کارنامے، ادارہ تصنیف و تحقیق، کراچی، ۱۹۸۶، ص: ۳۱-۶۷

[۲]

G Rasool Abduh, *The Educational Ideas of Maulana Abul Kalam Azad*, New Delhi, 1973, p.19; Azad, Maulana Abul Kalam, *India wins Freedom,* the complete version, Orient Longman, Delhi, 1988; Mobaraka Moosavi, Role of Maulana Azad in Modernising Education, *International Journal of Education, Modern Management, Applied Science & Social Science (IJEMMASSS)*, volume 03, No. 03(II), July-September, 2021, pp.74-77.

کی، جس کے دائرۂ کار میں سائنس اور ثقافت جیسے اہم شعبے شامل تھے۔ ان کا یقین تھا کہ تعلیم، سائنسی شعور اور ثقافتی بیداری نئے ہندوستان کے خواب کو حقیقت میں ڈھالنے میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا کا وژن ایک ایسے ہندوستان کا تھا جو اپنی ہم آہنگ مشترکہ تہذیب، ثقافتی تنوع میں پوشیدہ وحدت، قومی یکجہتی، صداقت، رواداری اور عدل و انصاف جیسے اوصاف سے مزین ہو، اور جو مشرق و مغرب کی فکری و تہذیبی اقدار کو ہم آہنگ کر کے ایک نئی تخلیقی شناخت تراشنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ان کے نزدیک ترقی کی راہ اس وقت ہموار ہو سکتی ہے جب قوم ناخواندگی، جہالت، جمود اور غربت جیسے مسائل کا قلع قمع کرے، اور خود کو عالمی برادری کے ہم پلہ بنانے کے قابل بنائے۔ مولانا آزاد نے نہ صرف تعلیم کو قومی خود اختیاری کا ذریعہ تصور کیا، بلکہ اس کے ذریعے ہندوستانی قوم میں فکری وحدت، کثرت میں وحدت کے شعور، اور تیزی سے بدلتے عالمی منظرنامے کی تفہیم کو فروغ دینے کی مخلصانہ کوشش کی۔ ان کا تعلیمی فلسفہ تکثیری معاشرے میں بقائے باہمی کے اصولوں سے ہم آہنگ ہے، جو تہذیبی ورثے کے تحفظ کے ساتھ ساتھ جدید دور کے تعلیمی تقاضوں کو بھی گہرے فہم کے ساتھ پیش کرتا ہے۔[۳]

مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلیمی افکار کی بنیاد چار اہم ستونوں پر استوار تھی: ذہنی بیداری، اتحاد و ترقی، مذہبی رواداری اور عالمی اخوت۔ ان کے نزدیک آزاد ہندوستان میں تعلیم کا اصل مقصد نئی نسل میں ذہنی بیداری پیدا کرنا تھا، کیونکہ انگریزی تعلیمی نظام نے نوجوانوں کے ذہنوں میں دو زہریلے تصورات کو جڑ پکڑنے کا موقع دیا تھا: غلامی اور علاحدگی پسندی۔ انگریزوں کا تعلیمی مقصد صرف ایسے افسران پیدا کرنا تھا جو ان کے استعماری مفادات کی تکمیل میں معاون ثابت ہوں، اور اسی مقصد کے تحت انہوں نے فرقہ واریت اور علٰحدگی پسندی کا بیج بویا، جسے اپنے تعلیمی طریقہ کار کے ذریعے مزید گہرا کیا۔ مولانا کا ماننا تھا کہ اس زہر کو نئی نسل کے ذہنوں سے نکالنا ضروری ہے۔

ان کے تعلیمی افکار میں غلامی کی جگہ آزادی اور تعصب کی جگہ مذہبی رواداری کو مرکزی مقام

---

[۳] محمد ضیاء الدین انصاری، مولانا آزاد، سرسید اور علی گڑھ، انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، ۱۹۹۲، ص: ۳۰۷-۳۰۸؛
Pandey and Mohanty, "Educational Thoughts of Abul Kalam Azad and Its Relevance in Modern Era", *International Journal of Novel Research and Development*, volume 8, issue 11 November 2023, p. 527

حاصل تھا تاکہ ہم مغربی اثرات سے آزاد ہو کر اپنے مستقبل کو سنواریں۔ مولانا آزاد تعلیم کو صرف ملازمتوں کے حصول کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس کے ذریعے وہ ذہنوں کی بیداری اور فرد کی خود کفالت کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ مغربی طرزِ تعلیم نے تقریباً دو صدیوں تک نئی نسل میں ذہنی انحطاط اور تنگ نظری کو بڑھاوا دیا تھا، جس کے نتیجے میں لوگ انگلینڈ میں تعلیم حاصل کرنے کو باعث فخر سمجھتے اور اپنے وطن کے علمی ذخائر کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس تعلیمی بحران میں تبدیلی لانا ایک ضرورت بن چکا تھا۔ مولانا آزاد کی تعلیم کے بارے میں سوچ نہ صرف ترقی پسندانہ تھی بلکہ انہوں نے اسے نفسانی اور سامراجی غلامی سے نجات کا واحد ذریعہ قرار دیا۔ پٹنہ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں اس بات پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا نے واضح کیا تھا کہ تعلیم ہی وہ واحد طاقت ہے جو قوم کو اس زہریلی غلامی سے آزاد کر سکتی ہے: ”سوال یہ ہے کہ اب تک تعلیم پر ہمارا کوئی کنٹرول نہیں تھا۔ اس پر غیر ملکی حکومت کا قبضہ تھا۔ جو کچھ انہوں نے پڑھایا، ممکن ہے صحیح ہو لیکن جس طرح پڑھایا اس نے ہمارے ذہنوں کو بجائے کھولنے کے بند کر دیا“[۴]۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اعتدال اور توازن کو اپنی فکری و عملی زندگی کا شعار بنایا۔ ان کے نزدیک آزاد ہندوستان کے لیے نہ خالصتاً مغربی طرزِ تعلیم کارآمد تھا، نہ محض روایتی مشرقی نظام، بلکہ ایک ایسا مربوط تعلیمی ماڈل درکار تھا جو مشرق و مغرب کے بہترین عناصر کو یکجا کر کے دل و دماغ، عقلیت و روحانیت اور سائنس و اخلاق کے مابین توازن قائم کر سکے۔ ان کی نظر میں تعلیم کا نظام ایسا ہونا چاہیے جو نہ صرف ذہنی ارتقا کا ذریعہ بنے بلکہ روحانی اور اخلاقی نشوونما کا ضامن بھی ہو۔ نصابِ تعلیم اور تدریسی طریقہ کار کے حوالے سے مولانا آزاد کا موقف متوازن اور حقیقت پسندانہ تھا۔ وہ مضمونِ تعلیم میں جدت اور تدریس کے انداز میں روایت کے قائل تھے۔ یعنی مضامین جدید ہوں، مگر تدریس کا انداز گہرائی اور فکری تربیت سے بھرپور ہو۔ ان کے تعلیمی فلسفے کی بنیاد مشرقی روحانی اقدار اور مغربی سائنسی سوچ کے امتزاج پر تھی تاکہ نئی نسل نہ صرف سائنسی مہارت حاصل کرے بلکہ انسانیت، اخوت، اخلاق اور سماجی فلاح جیسے مقاصد سے بھی بہرہ مند ہو۔

---

[۴] مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلیمی نظریات کو سمجھتے ہوئے تعلیمی بیداری ضروری UNA NEWS – ؛ مولانا ابوالکلام آزاد بحیثیتِ ماہرِ تعلیم Millat Times

جید عالمِ دین اور مشرقی تہذیبی روایت کے علمبردار ہونے کے باوجود مولانا آزاد نے سائنس اور ٹیکنالوجی کو قومی ترقی کے لیے لازمی قرار دیا۔ ان کا ماننا تھا کہ علم کی خوبی اور افادیت اس کے ماخذ سے نہیں، بلکہ اس کے اثرات اور مقاصد سے جانی جاتی ہے۔ وہ کہتے تھے: "جو علم و فکر فائدہ مند ہو، وہ جہاں سے بھی ملے، اسے اختیار کرو؛ اور جو مضر ہو، وہ خواہ کسی بھی ماخذ سے ہو، اسے ترک کر دو"۔ وہ اس فکری منہج پر زندگی بھر کاربند رہے۔ مولانا آزاد تعلیم کو محض حصولِ روزگار کا وسیلہ نہیں بلکہ شخصیت سازی، فکری آزادی، اور قومی شعور کی بیداری کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک ایک متوازن، ہم آہنگ اور بامقصد تعلیمی نظام ہی حقیقی معنوں میں قوم کی فکری تعمیر کر سکتا ہے۔ تعلیم کے مقصد کے بارے میں وہ لکھتے ہیں: "تعلیم کا واحد مقصد روزی اور روٹی کمانا نہیں ہونا چاہئے بلکہ تعلیم سے شخصیت سازی کا کام بھی لیا جائے اور یہی تعلیم کا سب سے مفید پہلو ہے اور اسی سے معاشی و تمدنی نظام بھی بہتر ہو سکے گا۔ میں مسلمان ہوں اور مجھے ہندوستانی ہونے پر فخر ہے! میں ہندوستان کے ناقابل تسخیر اتحاد کا ایک حصہ ہوں"۔ ہندو مسلم اتحاد کی علامت کے بارے میں انھوں نے ایک بار سرسید کا ایک خوبصورت استعارہ نقل کیا کہ "ہندو اور مسلمان ہندوستان کی ماں کے چہرے کی دو آنکھیں ہیں"[۵]۔

وہ قومی یکجہتی کو انسان دوستی اور تعلیم کے لئے سب سے اہم سمجھتے تھے۔ انہوں نے اس کو مسلم عقیدے کی ضد نہ مانا ہے اور نہ ہی اس کو مسلمانوں کو دین سے دوری قرار دیا ہے:

> میں اعتقاد توحید و رسالت اور عمل صالحہ کو نجات کے لیے کافی سمجھتا ہوں۔ اس کے سوا مجھے اور کچھ معلوم نہیں۔ قرآن کریم مسلمانوں کا حقیقی امام ہے۔[۶]

وہ مزید لکھتے ہیں:

> جو رسوم و زوائد عوام کے فلاحی عقائد میں داخل ہو گئے ہیں ان کی اصلاح کا یہ طریقہ نہیں کہ ہم عوام کے جذبات کو مشتعل کریں۔ اس سے اصلاح نہیں ہو سکتی بلکہ اور نئی اجتماعی نفرتیں پیدا ہو جاتی ہیں"۔[۷]

---

[۵] ابوالکلام آزاد، آزادی ہند، [اردو ترجمہ انڈیا ونس فریڈم از ہمایوں کبیر] مکتبہ جمال، لاہور ۲۰۰۳۔

[۶] مولانا ابوالکلام آزاد، الہلال، جلد ۴، شمارہ ۱، صفحہ ۲۴

[۷] ابوالکلام آزاد، آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ایڈیٹر: عبدالرزاق ملیح آبادی،، حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۵۸، صفحہ ۲۷۲

لوگ دنیا میں سینکڑوں قوتوں کے محکوم ہیں، ماں باپ کے محکوم ہیں اگرچہ وہ دنیا میں بغیر کسی زنجیر اور بیڑی کے آئے تھے۔ مگر دنیا نے ان کے پاؤں میں بہت سی بیڑیاں ڈال دی ہیں۔[۸]

گھریلو زندگی کے فرائض سے جس درجہ آج یہ قوم (مسلمان) غافل ہے، گھریلو زندگی کے فوائد سے جس درجہ آج یہ قوم نا آشنا و محروم ہے اس پر جتنا افسوس کیا جائے، ان کی بد بختی پر جتنا ماتم کیا جائے، بجا ہے۔[۹]

میکالے کی یہ دلیل کہ سنسکرت اور فارسی کو ذریعۂ تعلیم نہیں قرار دیا جاسکتا، غلط نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حجت لغو ہے کہ ذریعۂ تعلیم صرف انگریزی زبان ہو سکتی ہے۔[۱۰]

میرے بھائی! میں نے ہمیشہ سیاسیات کو ذاتیات سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے اور کبھی اس پر خار وادی میں قدم نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ میری بہت سی باتیں کنایوں کا پہلو لیے ہوتی ہیں۔[۱۱]

ہندوستان کے پہلے وزیرِ تعلیم ہونے کے ناطے مولانا ابوالکلام آزاد نے قومی تعلیمی ڈھانچے کو ایک فکری و قار، نظریاتی عمق اور ہمہ گیر معیار عطا کیا۔ انہوں نے نہ صرف تعلیمی نظام کی اصلاح و تنظیم کی بنیاد رکھی بلکہ ایک ایسے تعلیمی فلسفے کی تشکیل کی جو علم، کردار اور قوم سازی کو باہم مربوط کرتا ہے۔ ایک صاحبِ بصیرت مفکر، مدبر اور ہمہ گیر فہم رکھنے والے رہنما کی حیثیت سے مولانا کو نہ صرف علمی و ادبی حلقوں میں بلکہ سیاسی و سماجی میدان میں بھی غیر معمولی اثر و رسوخ حاصل تھا۔ ملک کی صفِ اوّل کی قیادت — جس میں مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار ولبھ بھائی پٹیل جیسی عظیم شخصیات مولانا آزاد کی فکری گہرائی اور سیاسی بصیرت کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ نہرو نے اس حقیقت کا اعتراف بارہا اپنے بیانات اور تحریروں میں کیا، جہاں وہ مولانا کو نہ صرف ایک باوقار رہنما بلکہ ہندوستانی سیاست و تعلیم کا روشن چراغ قرار دیتے ہیں:

میں صرف عملی سیاست ہی نہیں جانتا، سیاست کا طالب علم بھی ہوں۔ علم سیاست کی کتابیں مجھ

---

[۸] ابوالکلام آزاد، آزاد کی تقریریں، ایڈیٹر: انور عارف، ادبی دنیا اردو بازار، دہلی، ۱۹۶۱ء، ص: ۱۳۵

[۹] ماخذ سابق، ص: ۱۴۷

[۱۰] ماخذ سابق، ص: ۱۷۶

[۱۱] انور دہلوی، ابوالکلام آزاد کے سوانح حیات، مکتبہ اردو، دہلی، ب۔ت۔ ص: ۱۷

سے زیادہ ہندوستان میں کسی اور نے نہیں پڑھیں۔ میں تیسرے چوتھے سال یورپ کا بھی دورہ کرتا ہوں جہاں سیاست کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے سیاست کے تازہ ترین علم سے واقفیت حاصل کر لی ہے۔ لیکن جب ہندوستان پہنچ کر مولانا ابوالکلام آزاد سے باتیں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب بھی بہت آگے ہیں۔[۱۲]

مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلیمی نظریات برّصغیر کی تعلیمی فکر میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا تصورِ تعلیم محض مذہبی یا اخلاقی حدود تک محدود نہیں تھا، بلکہ وہ اسے قومی تعمیر، فکری آزادی، سماجی عدل، اور جدیدیت سے ہم آہنگ ایک جامع نظام کے طور پر دیکھتے تھے۔ ان کے خیالات نہ صرف تعلیم کی افادیت بلکہ اس کے ذریعے ایک ہم آہنگ، باشعور اور ترقی پسند معاشرے کی تشکیل پر مرکوز تھے۔

۱- تعلیم کو ایک بنیادی انسانی حق کا درجہ دینا: مولانا آزاد کا پختہ یقین تھا کہ تعلیم ہر فرد کا بنیادی حق ہے، خواہ وہ کسی بھی نسل، مذہب، جنس یا سماجی طبقے سے تعلق رکھتا ہو۔ ان کے نزدیک تعلیم ایک ایسا وسیلہ ہے جو فرد کو شعور، خود اعتمادی اور خود انحصاری عطا کرتا ہے۔ وہ اصرار کرتے تھے کہ قوم کی حقیقی آزادی کا حصول صرف اسی وقت ممکن ہے جب ہر بچہ، خاص طور پر خواتین اور محروم طبقات، علم کی روشنی سے بہرہ ور ہوں۔ انہوں نے کہا: ”اگر ہم آزاد قوم بننا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے ہر بچے کو تعلیم دینا ہو گی“۔[۱۳]

۲- مفت اور لازمی تعلیم کی وکالت: انہوں نے ابتدائی تعلیم کو ہر بچے کے لیے مفت اور لازمی بنانے کی پرزور حمایت کی۔ ان کے مطابق تعلیم تک مساوی رسائی ایک فعال اور باشعور جمہوریت کی بنیاد ہے، اور اس کے بغیر معاشرتی عدل اور ترقی کا خواب ادھورا رہتا ہے۔

۳- سیکولر اور غیر متعصب تعلیم کا تصور: ایک مذہبی عالم ہونے کے باوجود مولانا آزاد کا تعلیمی نظریہ غیر فرقہ وارانہ اور جدید اقدار سے ہم آہنگ تھا۔ ان کا ماننا تھا کہ تعلیم کو ہر قسم کے مذہبی، نسلی اور لسانی تعصبات سے پاک ہونا چاہیے تاکہ یہ فرد کی تخلیقی و تنقیدی صلاحیتوں کو

---

[۱۲] رشید الدین خاں، ابوالکلام آزاد: ایک ہمہ گیر شخصیت، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۳ء، ص: ۱۲

[۱۳] ڈاکٹر شمیم احمد، مولانا آزاد کی تعلیمی خدمات، *Urdu Research Journal*، جولائی- ستمبر ۲۰۲۱ء، ص: ۴۷-۵۲

پروان چڑھا سکے۔ وہ چاہتے تھے کہ تعلیم علمی وسعت، فکری تنوع اور ثقافتی ہم آہنگی کو فروغ دے[۱۴]۔

۴- سائنس و ٹیکنالوجی کی تعلیم کو قومی ترقی سے جوڑنا: مولانا آزاد نے سائنسی اور تکنیکی تعلیم کو جدید ہندوستان کے لیے ناگزیر قرار دیا۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی ہی قوم کو اقتصادی خود کفالت اور عالمی ہمسری کی راہ پر گامزن کر سکتی ہے[۱۵]۔ انہی کی بصیرت کا نتیجہ تھا کہ IIT's جیسے اعلیٰ تعلیمی ادارے قائم کیے گئے، جو آج ہندوستان کے سائنسی تشخص کی علامت بن چکے ہیں۔

۵- قومی زبانوں اور ثقافتی ورثے کا تحفظ و فروغ: مولانا آزاد کی نظر میں زبان اور ثقافت کسی قوم کی روحانی شناخت کا حصہ ہوتے ہیں۔ مادری زبان میں تعلیم کو مؤثر سمجھتے تھے اور اردو، ہندی، بنگالی سمیت تمام ہندوستانی زبانوں کے فروغ کے حامی تھے۔ انہوں نے کہا: "قومیں اپنی زبانوں میں ہی سوچ سکتی ہیں، ترقی کر سکتی ہیں"۔[۱۶]

۶- اخلاقی و روحانی تربیت کو تعلیم کا جزوِ لازم بنانا: ان کے نزدیک تعلیم کا نصب العین صرف علم کا حصول نہ تھا، بلکہ وہ انسان کی کردار سازی، اخلاقی تربیت اور روحانی بالیدگی کو بھی اسی قدر اہم تصور کرتے تھے۔ ان کے نزدیک ایک تعلیم یافتہ انسان وہی ہے جو علم کے ساتھ ساتھ اخلاق، برداشت اور انسان دوستی کا حامل ہو۔ ارمغان آزاد میں ہے کہ:

> خواتین کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا لازم ہے تاکہ ان میں یہ صلاحیت پیدا ہو کہ وہ اپنی اولاد کی عمدہ تربیت خود انجام دے سکیں۔ ابتدائی عمر سے ہی ان کے اندر اخلاقی اقدار کو راسخ کرنے کی سعی کی جائے۔ اس شعوری جدوجہد کے نتیجے میں جو نسل ہندوستان میں پروان چڑھے گی، وہ بلاشبہ ایک تعلیم یافتہ قوم کے لیے باعث افتخار اور وطن کے لیے موجب عزت ثابت ہوگی۔[۱۷]

۷- تعلیم میں مساوات کا اصول: مولانا آزاد نے تعلیم میں مساوی مواقع کو بنیادی اصول قرار

---

[۱۴] ماخذ سابق، ص:۵۱-۵۵

[۱۵] ہمایوں کبیر، مولانا ابوالکلام آزاد: کتاب التذکرہ، ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ، حیدر آباد، ص:۱۳۱

[۱۶] ابوالکلام آزاد، آزاد کی تقریریں، ایڈیٹر: انور عارف، ادبی دنیا، دہلی، ۱۹۶۱ء، ص:۲۸۲

[۱۷] ابو سلمان شاہجہانپوری، ارمغان آزاد، مکتبہ رشیدیہ کراچی، ۱۹۹۰ء، حصہ دوم، ص:۲۱۰

دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ تعلیمی وسائل اور مواقع امیر و غریب، شہری و دیہی، مرد و زن کے لیے یکساں ہوں، تاکہ سماجی ناہمواری ختم ہو اور ہر فرد ترقی کے سفر میں شریک ہو سکے۔

۸- عملی اقدامات اور میراث: ۱۹۴۷ سے ۱۹۵۸ء تک بطور پہلے وزیر تعلیم، مولانا آزاد نے تعلیمی اصلاحات کی بنیاد رکھی۔ ان کے دورِ وزارت میں متعدد ادارے اور پالیسی اقدامات عمل میں لائے گئے۔ انہوں نے نہ صرف تعلیم کو ایک سماجی ترجیح بنایا بلکہ قومی تعمیر کے بنیادی ستون کے طور پر اسے آگے بڑھایا۔ ان کی پالیسیوں نے آزاد ہندوستان کے تعلیمی و فکری منظر نامے کی بنیادیں مضبوط کیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی تعلیمی خدمات میں سب سے نمایاں پہلو اُن کی وہ پالیسی سازی اور ادارہ جاتی بنیادیں ہیں جنہوں نے ہندوستان کے جدید تعلیمی ڈھانچے کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کیا۔ بحیثیت وزیرِ تعلیم، انہوں نے کئی ایسے ادارے قائم کیے یا تقویت بخشی جو آج بھی تعلیمی، ادبی، سائنسی اور ثقافتی ترقی کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔

ادارہ جاتی قیادت اور اصلاحات: یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (UGC): اگرچہ اس کمیشن کا ابتدائی قیام ۱۹۴۵ء میں عمل میں آیا تھا، تاہم مولانا آزاد کی قیادت میں اس کا پہلا باضابطہ اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۹۵۳ کو منعقد ہوا، جس سے اعلیٰ تعلیم میں معیار اور فنڈنگ کے حوالے سے نئی سمتیں متعین ہوئیں۔

- انڈین کاؤنسل فار کلچرل ریلیشنز (ICCR) ۱۹۵۰: یہ کاؤنسل بین الاقوامی سطح پر ثقافتی روابط کو فروغ دینے کے لیے مولانا آزاد کے وژن کا ایک مظہر تھی۔
- ساہتیہ اکادمی (Sahitya Akademi): ۱۳ مارچ ۱۹۵۴ کو نیشنل اکیڈمی آف لیٹرز کے طور پر قائم کی گئی۔ یہ ادارہ ہندوستانی زبانوں اور ادب کے فروغ کے لیے مولانا کے ثقافتی وژن کا ثبوت ہے۔
- شانتی نکیتن کو ۱۹۵۱ء میں مرکزی یونیورسٹی کا درجہ دینا، ہندوستانی فلسفہ، فن اور روحانی علوم کے فروغ کی طرف اہم قدم تھا۔
- للت کلا اکادمی (Lalit Kala Akademi) اور سنگیت ناٹک اکادمی

(Sangeet Natak Akademi) جیسے ادارے ادب، فنون لطیفہ اور موسیقی جیسے شعبوں کے فروغ کے لیے قائم کیے گئے، تاکہ ہندوستان کے ثقافتی ورثے کو نہ صرف محفوظ رکھا جائے بلکہ جدید تقاضوں سے ہم آہنگ بھی کیا جاسکے۔

- کاؤنسل فار سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (CSIR) اور انڈین کونسل فار سوشل سائنس ریسرچ جیسے ادارے تحقیق و اختراع کو فروغ دینے کے لیے قائم کیے گئے، جنہوں نے سائنس و سماجی علوم کے میدان میں تحقیق کی نئی راہیں کھولیں۔
- انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (IIT's): ٹیکنیکل تعلیم کی عصری ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ان اداروں کی بنیاد مولانا آزاد کے تعلیمی وژن کا عملی اظہار تھی۔
- انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل اسٹڈیز (۱۹۵۵): جیسے ادارے بین الاقوامی تعلقات، سماجی علوم اور جدید تحقیق کے لیے قیام میں لائے گئے۔
- نیشنل انسٹی ٹیوٹ برائے بنیادی تعلیم اور آل انڈیا کاؤنسل فار سیکنڈری ایجوکیشن جیسے اداروں نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے معیار کی بہتری اور پالیسی سازی میں اہم کردار ادا کیا۔
- سنٹرل بیورو آف ٹیکسٹ بک ریسرچ اور تعلیمی و پیشہ ورانہ رہنمائی کا مرکزی بیورو ایسے اقدامات تھے جو درسی مواد، طلبہ کی رہنمائی، اور تدریسی حکمت عملیوں کو جدید خطوط پر استوار کرنے کے لیے عمل میں لائے گئے۔
- نیشنل کاؤنسل برائے دیہی اعلیٰ تعلیم (۱۹۵۶): اس ادارے کا قیام دیہی علاقوں میں اعلیٰ تعلیم کو فروغ دینے کے عزم کا مظہر تھا، تاکہ تعلیمی مساوات کو یقینی بنایا جاسکے۔
- سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن: اساتذہ کی پیشہ ورانہ تربیت اور تدریسی صلاحیتوں کو بہتر بنانے کے لیے یہ ادارہ قائم کیا گیا، جس سے قومی سطح پر تدریس کا معیار بلند ہوا۔
- ملک بھر میں لائبریری نیٹ ورکس کو وسعت دی گئی، تاکہ علم تک رسائی آسان ہو اور علمی فضا پروان چڑھے۔
- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسے اداروں کی سرپرستی اور ترقی میں مولانا آزاد نے کلیدی

کردار ادا کیا، کیونکہ وہ انہیں قومی تعلیمی تشخص کے نمائندہ ادارے تصور کرتے تھے۔

- مولانا آزاد کا تعلیمی وژن صرف فلسفہ یا بیانیہ نہ تھا، بلکہ ایک ایسا عملی خاکہ تھا جس نے آزاد ہندوستان کے تعلیمی نظام کو ادارہ جاتی بنیادوں پر استوار کیا۔ وہ محض نظریہ ساز نہیں، بلکہ عمل کے میدان کے معمار بھی تھے۔

تعلیمی منصوبہ بندی میں پہلی قومی تعلیمی پالیسی کی فکری بنیاد: مولانا ابوالکلام آزاد کا رسمی پیشہ تدریس نہ تھا، لیکن جب ان کے تعلیمی خیالات اور عملی خدمات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے تعلیمی نظریات اور نظام کی بنیادوں میں نہایت مؤثر اور تاریخی کردار ادا کیا۔ اس ضمن میں ہمایوں کبیر اپنی کتاب "ہندوستان میں نظامِ تعلیم" کے انتساب میں مولانا کے کردار کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ابوالکلام نے گاندھی اور ٹیگور کے ساتھ مل کر ہمارے قومی نظام تعلیم کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا تھا"۔

آزاد ہندوستان کے پہلے وزیرِ تعلیم کے طور پر مولانا آزاد نے واضح طور پر اس اصول کو اپنایا کہ کوئی بھی قوم اس وقت تک ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتی جب تک کہ تعلیم کو مرکزی ترجیح نہ بنایا جائے۔ ان کا ماننا تھا کہ تعلیم ہی وہ طاقت ہے جو ہندوستان کو نہ صرف دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کی صف میں لا سکتی ہے بلکہ اسے تہذیبی و فکری سطح پر خود مختار اور باوقار بھی بنا سکتی ہے۔ گیارہ سالہ دورِ وزارت کے دوران، انہوں نے تعلیمی میدان میں جو عملی اقدامات کیے، وہ آج بھی ہماری قومی تعلیمی میراث کا قیمتی حصہ ہیں۔

روحانی و مادی توازن کا نظریہ: مولانا آزاد کی خواہش تھی کہ تعلیمی نظام میں روحانی اقدار اور مادی ترقی کے درمیان ایسا ہم آہنگ اور متوازن رشتہ قائم ہو جو انسان کو مکمل شخصیت کی صورت میں پروان چڑھائے۔ وہ تعلیم کو صرف ایک پیشہ ورانہ یا تکنیکی مہارت کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس میں اخلاقیات، فلسفہ، روحانیت اور انسانیت جیسے عناصر کی شمولیت کو لازمی خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک سائنس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم تھی، لیکن اگر اس سے اخلاقی اور فکری رہنمائی منقطع ہو جائے تو وہ انسانی ترقی کے بجائے انحطاط کا باعث بن سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا، علم کو وسیلہ سمجھتے تھے، نہ کہ حتمی مقصد۔

قومی تعلیمی نظام کا نظریہ: مولانا آزاد کا تعلیمی فلسفہ ایک ایسے قومی نظامِ تعلیم کا داعی تھا جو قوم کی اجتماعی شناخت، تمدنی ورثے اور فکری خود مختاری کا محافظ بن سکے۔ ان کے مطابق تعلیم کو ایسا جامع و مربوط ہونا چاہیے جو نہ صرف ماضی سے رشتہ قائم رکھے بلکہ عصرِ حاضر کے تقاضوں سے بھی ہم آہنگ ہو۔ وہ تعلیم کو ایک "تہذیبی عمل" سمجھتے تھے، جو قوم کو محض ماضی کی یادگار بنانے کے بجائے، اُس کے شعور کو نئی سمتوں سے روشناس کرائے۔ ان کے الفاظ میں:

> ہم اپنی قسمت کے آج معمار ہیں۔ آج ہمیں خود کو اور اپنے گھروں کو سنبھالنا ہے اور ان حصوں کو درست رکھنا ہے جو توجہ کے طالب ہیں۔ قومی نظام تعلیم قومی زندگی کے لیے ایک لازمی ضرورت ہے۔[۱۸]

اسی طرح آزادی کی بقاء، اس کی خوشحالی اور ترقی کے لئے بھی قومی تعلیم کی ضرورت و اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ " آج عالمی طور پر اس بات کو تسلیم کیا جاچکا ہے کہ حکومتوں کے کاموں میں بنیادی کام تعلیم سے متعلق ہے کیونکہ افراد کی تربیت کے بغیر جمہوریت کا تصور بے کار سی بات ہو گی "[۱۹]۔ مولانا آزاد کے نزدیک تعلیم در حقیقت انسان کی اندرونی اصلاح کا نام ہے اور تمدن ان کی نظر میں انسان کا خارجی پہلو ہے اس لئے وہ اس بات کے قائل ہیں کہ پہلے نفس انسانی کی تربیت بہتر سے بہتر طریقے پر کی جائے۔ مولانا کے تعلیمی تصورات و نظریات کو ہم مجموعی طور پر سامنے رکھ کر اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ ان کے تعلیمی تصورات دراصل تعلیمات قرآنی کے بلیغ ترجمان ہیں۔ قرآن مجید میں بار بار انسانوں کو غور و فکر کی تاکید کی گئی ہے، جابجا مظاہر فطرت چاند، سورج، ستاروں، رات، دن، فصلوں کا بڑھنا، سمندروں کی موجیں، پہاڑوں کی ہیئت، جانوروں کی قسمیں اور پرندوں کی پرواز وغیرہ پر غور کرنے کی تلقین کی گئی ہے تاکہ خدا کی ہستی کا یقین ہم میں راسخ ہو جائے۔ اسی کے تحت مولانا آزاد بھی تمام انسانوں کو تفکر و تعقل کی دعوت دیتے ہیں لیکن یہ بات یاد رہے کہ وہ عقل کو ہی سب کچھ قرار نہیں دیتے بلکہ اس کا بھی برملا اظہار کرتے ہیں کہ کچھ علوم تک پہنچنا بسا اوقات انسانی عقل کی دسترس سے باہر ہوتا ہے۔

---

[۱۸] قومی نظام تعلیم کی تشکیل میں مولانا آزاد کا اہم کردار، – Baseerat online Urdu news portal
Maulana Azad National Urdu University /satcamplkw_incharge_urdu.php

[۱۹] مولانا ابوالکلام آزاد اور فلسفۂ تعلیم Zindagi-e-Nau – قومی نظام تعلیم کی تشکیل میں مولانا آزاد کا اہم کردار –
Baseerat Online Urdu News Portal

حصول علم پر زور دیتے ہوئے مولانا آزاد اقدار اسلامی کے تحفظ و پاسداری کا بھی درس دیتے ہیں۔ وہ خود کو اسلامی علوم و فنون اور تہذیب کا امین گردانتے ہوئے کہتے ہیں: ”میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم و تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں“ [۲۰]۔ اسی کے ساتھ ان کا مشہور بیان آج بھی قومی یکجہتی اور مشترکہ قومیت کے حوالے سے ایک مستحکم فکری بنیاد فراہم کرتا ہے:

> میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ناقابلِ تقسیم اور متحدہ قومیت کا جزو لاینفک ہوں۔ اس قومیت کی تکمیل میرے بغیر ممکن نہیں۔ میں اس مثلث کا ایک ناگزیر زاویہ ہوں، اور اپنے اس دعوے سے کبھی دستبردار نہیں ہو سکتا۔

آزاد کے تعلیمی افکار اور NEP 2020 : مولانا آزاد کے تعلیمی نظریات کو اگر موجودہ قومی تعلیمی پالیسی (NEP 2020) کے تناظر میں دیکھا جائے تو کئی سطحوں پر فکری ہم آہنگی اور اصولی اشتراک سامنے آتا ہے:

- **انسانی شخصیت کی ہمہ جہت نشوونما:** مولانا تعلیم کو محض علمی ترسیل نہیں بلکہ ایک فکری، اخلاقی اور روحانی تربیت کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ یہی تصور NEP 2020 کے اُس وژن سے مطابقت رکھتا ہے جو تعلیم کو فرد کی ہمہ گیر ترقی، شخصیت سازی، اور اقدار پر مبنی تربیت سے جوڑتا ہے۔
- **روایتی اور جدید علوم کا امتزاج :** مولانا آزاد سائنس و ٹیکنالوجی کے ساتھ دینیات، فلسفہ

---

[۲۰] رسالہ جامعہ، ابوالکلام آزاد: ایک شخص، ایک روایت، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، ص: ۸۳

[۲۱] خطبات آزاد (مرتبہ مالک رام) ساہتیہ اکادمی دہلی، مولانا ابوالکلام آزاد، خواجہ غلام السیدین ”ابوالکلام آزاد نمبر“ ص: ۸۲۔۸۳ ص: ۵۰۔۵۱ مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے، مرتبہ خلیق انجم، انجمن ترقی اردو (ہند) دلی، ص: ۲۰۳۔۲۰۴

اور تہذیبی ورثے کو تعلیم کا جزوِ لاینفک مانتے تھے۔ NEP 2020 بھی جدید تعلیمی ڈھانچے میں روایتی ہندوستانی علوم، مقامی زبانوں اور ثقافتی تنوع کو یکساں اہمیت دیتا ہے۔

- تعلیم کی شمولیت: مولانا کا زور تھا کہ تعلیم ہر فرد کا حق ہے، خواہ وہ کسی بھی طبقے یا جنس سے تعلق رکھتا ہو۔ NEP 2020 بھی تعلیم کو ہر بچے تک پہنچانے، خاص طور پر پسماندہ طبقات اور لڑکیوں کی تعلیم کو فروغ دینے پر زور دیتی ہے۔
- بنیادی تعلیم پر توجہ: مولانا نے اپنی وزارتِ تعلیم کے دوران ابتدائی تعلیم کو ترجیحی بنیادوں پر فروغ دینے کی کوشش کی، جو NEP 2020 کے اس بنیادی ہدف سے میل کھاتی ہے کہ ہر بچہ خواندگی، عددی فہم اور سیکھنے کی بنیادی مہارتیں حاصل کرے۔

عصری چیلنجز اور فکری میراث کا تسلسل: تاہم، اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ آج کے بدلتے ہوئے تعلیمی، سماجی اور تکنیکی ماحول میں مولانا آزاد کے افکار کو بعض چیلنجز کا سامنا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی تعلیمی بصیرت نے ہندوستانی نظامِ تعلیم کو نہ صرف فکری گہرائی عطا کی بلکہ عملی بنیادوں پر ایک ایسا وژن فراہم کیا جس پر آنے والے کئی عشروں تک تعلیمی پالیسیاں استوار کی گئیں۔ ان کے افکار میں بین الاقوامیت، انسانیت، رواداری، اور روحانی توازن جیسے عناصر کی جھلک نمایاں ہے۔ وہ تعلیم کو محض ملازمت کا ذریعہ نہیں، بلکہ ایک فکری انقلاب کا وسیلہ تصور کرتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا تعلیمی نظریہ ایک متوازن، انسان دوست، ہمہ گیر اور ترقی پسند وژن ہے۔ ان کے افکار آج بھی ہندوستانی تعلیمی پالیسیوں کے لیے رہنما اصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے تعلیم کو محض ایک ادارہ نہیں بلکہ ایک قومی فریضہ سمجھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوستان کے تعلیمی نظام کی بنیاد ایک ہمہ جہت اور سیکولر انداز میں رکھی۔ ان کے افکار آج بھی ہندوستان کے تعلیمی نظام میں روشنی کا مینار ہیں۔ ان کی بصیرت نے نہ صرف تعلیم کو ایک قومی مسئلہ بنایا بلکہ اسے ایک ایسا ہتھیار بنایا جو ہندوستان کو ترقی اور امن کی راہ پر گامزن کر سکتا ہے۔

جنوبی ہند کی زبانوں کے فروغ میں مسلمانوں کا تعاون

ڈاکٹر راہی فدائی
9448166536

قدرت نے ہندوستان کی جغرافیائی تقسیم اس طرح کی ہے کہ "بندھیاچل" پہاڑ کے نشیب کا حصہ جنوبی ہند کہلاتا ہے اور اوپر کا حصہ شمالی ہند کے نام سے مشہور ہوا ہے۔ جنوبی ہند کی زبانیں تمل، ملیالم، کنڑا اور تلگو دراوڈ خاندان کی زبانیں کہلاتی ہیں۔ دراویڈین تہذیب تقریباً پانچ ہزار سال پرانی ہے، جیسا کہ قدیم سندھ علاقے "موہنجوڈارو" میں بہ سال ۱۹۲۳ء اور قدیم پنجاب کے علاقہ "ہڑپہ" میں سنہ ۱۹۲۴ء میں کھدائی کے دوران جو سنگی کتبے برآمد ہوئے ان پر تحریر کردہ زبان قدیم تمل سے ملتی جلتی ہے۔ دراویڈ قوم سے متعلق مؤرخین کا بیان ہے کہ یہ دراصل "تورانی النسل" قوم ہے جس نے اپنے وطن سے ہجرت کر کے ہندوستان میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔

تمل کا اولین مستند شاعر "تروولوور"(Tiruvalluvar) ہے، جس نے تیسری صدی قبل مسیح میں اخلاقیات پر مبنی کتاب تروکرل(Tirukkural) تصنیف کی۔ یہ معرکہ آرا کتاب تیرہ سو تیس(۱۳۳۰) اشعار پر مشتمل ہے، جس کو پروفیسر حسرت سہروردی ترچی (متوفی ۲۰۰۳ء) نے اردو کا جامہ پہنا کر ۱۹۶۵ء میں "کرل" کے نام سے شائع فرمایا۔ اس کتاب پر ساہتیہ اکیڈمی دہلی کی جانب سے ترجمہ کا گرانقدر ایوارڈ عطا کیا گیا۔

تمل زبان کے اولین مسلم شاعر و مصنف عمر خطاب معروف بہ "عمر پلور"(متوفی ۱۱۱۵ھ / ۱۷۰۳ء) تھے، آپ نے حضور اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ کو تمل زبان میں منظوم کرتے ہوئے سیرہ پرانم (Sirah Puranam) نام رکھا۔ آپ کی یہ گرانقدر تصنیف پانچ سو چھبیس(۵۲۶) بندوں پر مشتمل ہے۔ اس مقتدر کتاب کو تمل ادبیات میں ممتاز مقام حاصل ہے۔

حضرت پیر محمد اپا(متوفی ۹۲۰ھ تقریباً) ایک عارف باللہ اور بلند پایہ تمل شاعر تھے۔ تراونکور (Travancore) کے راجہ آپ کے معتقد تھے۔ آپ نے ایک ہزار آٹھ سو(۱۸۰۰) اشعار پر مشتمل کتاب "روز میثاق مالے" تصنیف کی تھی۔ تیرہویں صدی ہجری کے مشہور و معروف

صوفی تمل شاعر سلطان عبد القادر لبی معروف بہ کننگڈی مستان (Kunangudi Mastan) تھے، جنہوں نے تمل زبان میں پر تاثیر ایک سو (۱۰۰) گیت رقم کئے۔ یہ نغمے، جن کے مصرعوں کی تعداد پانچ ہزار (۵۰۰۰) ہے، مستان پاڈاگل (Mastan Padagal) کے نام سے مشہور و مقبول ہوئے۔ آپ کا وصال ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء میں ہوا۔

شیخ تبھی پاؤلر تمل زبان کے قد آور شاعر اور مایہ ناز مجاہد آزادی تھے۔ آپ کی وفات ۱۳۶۹ھ / ۱۹۵۰ء کے نصف صدی بعد آپ کے اعزاز میں حکومت ہند نے پانچ روپے کا پوسٹل اسٹامپ مع تصویر ۲۰۰۸ء میں جاری کیا۔ ماہر لسانیات علامہ ضیاء الدین احمد امانی باقوی (متوفی ۱۹۶۶ء) نے تمل قواعد بالخصوص فعل ماضی کے اصل مرتب کئے۔ دور حاضر میں تمل زبان کے مشہور ناول نگار تپل محمد میراں (متوفی ۲۰۱۹ء) کو ساہتیہ اکیڈمی نے آپ کے ناول سائیونر کلی (The Reclined Chair) کے لئے ۱۹۹۷ء میں باوقار ایوارڈ سے سرفراز فرمایا تھا۔

اسی طرح تمل کے قد آور شاعر و ادیب سید عبد الرحمن (متوفی ۲۰۱۷ء)، جنہیں ادبی حلقوں نے کوی کو (Kavi Koo) یعنی بادشاہ شاعری کے خطاب سے نوازا تھا، اپنے گوناگوں ادبی شاہکاروں کی وجہ سے تمل ادب میں بلند مرتبہ و مقام کے حامل ہیں۔ آپ کے شعری مجموعے "آلاپنی" پر ساہتیہ اکیڈمی کا ایوارڈ تفویض ہوا تھا، آپ نے تمل شاعری میں سب سے پہلے غزلوں اور ہائیکو نظموں کو متعارف کرایا تھا۔ آپ کی کئی تخلیقات کو پروفیسر مظفر شہمیری نے اردو جامہ پہنایا۔

تمل زبان میں قرآن مجید کا اولین ترجمہ فاضل جامعہ باقیات اور مجاہد آزادی حضرت مولانا اے۔ کے عبد الحمید باقوی (متوفی ۱۹۵۵ء) نے کیا تھا جو سنہ ۱۹۴۹ء میں شائع ہو کر مشہور و متداول ہوا۔

جنوبی ہند کی دراویڈ زبانوں میں تمل کے بعد دوسرے نمبر پر ملیالم زبان ہے۔ ملیالم قدیم تمل میں سے بر آمد شدہ زبان تسلیم کی گئی ہے۔ یہ زبان بقول محققین ایک مغربی ساحلی بولی سے تیار ہوئی اور نویں صدی عیسوی میں بحیثیت زبان متعارف ہو گئی۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کا ورود مسعود سب سے پہلے جنوبی ہند کے مغربی ساحلی علاقہ "ملابار" میں ہوا تھا۔ یہ لوگ قبل اسلام صرف تاجر تھے مگر حلقہ بگوش اسلام ہونے کے بعد دین اسلام کے داعی بھی بن گئے۔ ان داعیوں نے نہ صرف اپنی عربی زبان مقامی باشندوں کو سکھائی بلکہ خود بھی ملیالم سیکھنے کی سعی کی، جس کے سبب ملابار میں ملیالم کے ہمدوش عربی بھی عوام میں رائج ہو گئی۔ اس صورت حال کے پیش نظر

مسلمانوں نے تعلیم وتعلم کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا، جس کو "عربی ملیالم" کہا جانے لگا۔ اس طرز نو میں زبان ملیالم ہوتی ہے مگر رسم الخط عربی رہتا ہے۔ یہ نیا اسلوب بے حد مشہور و مقبول ہوا، اس نہج پر تصنیف کردہ کتابوں کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہے۔

"عربی ملیالم" کی اولین مستند کتاب "محی الدین مالا" ہے، جس کے مصنف قاضی محمد صاحب (متوفی ۱۰۲۵ھ / ۱۶۱۶ء) ہیں۔ محی الدین مالا کی تخلیق سنہ ۱۰۱۶ھ /۱۶۰۷ء میں ہوئی۔ اس کا انگریزی ترجمہ کیلی سوتن (Keelisoton) نے کیا جو کیلی ٹکساس یونیورسٹی میں ریسرچ فیلو ہیں۔ مسلمان مصنّفین نے تقدیسی ادب کے ساتھ کیرالا کے سماجی و ثقافتی ادب میں اپنا ہنر آزمایا اور "عربی ملیالم" کے ہمدوش خالص ملیالی زبان میں ناول، افسانے، ڈرامے لکھے اور فصیح و بلیغ شاعری کی تو ملیالم ادب فکر و فن کی بلندیوں کو چھونے لگا۔ چنانچہ پدم شری ویکم محمد بشیر (۱۹۰۸ء-۱۹۹۴ء) نے، جو مجاہد آزادی بھی تھے، اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعے سماج میں انقلاب برپا کیا۔ حکومت ہند نے آپ کے اعزاز میں پانچ روپے کا پوسٹل اسٹامپ جاری کیا تھا۔

ملیالم زبان کے مسلم قلم کاروں میں کے-ٹی-محمد (۱۹۲۷ء- ۲۰۰۸ء) اعلیٰ درجے کے ڈرامہ نگار اور اسکرین پلے رائٹر تھے۔ آپ نے تقریباً چالیس ڈرامے سپرد قلم کئے اور بیس فلمی کہانیاں بھی لکھیں۔ آپ کو ملک اور بیرون ملک میں اعزازات سے نوزا گیا تھا۔

ملیالی ادب میں جدیدیت کے علم بردار این-پی-محمد (۱۹۲۸ء-۲۰۰۳ء) نے ناول نگاری اور افسانہ نویسی میں شہرت پائی، آپ نے تقریباً ایک سو افسانے لکھے۔ ۱۹۹۳ء میں آپ کو مرکزی ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے نوزا گیا۔ اس طرح ڈاکٹر پوناتل کنجی عبداللہ (۱۹۴۰ء-۲۰۱۷ء) جدید رجحانات کے قلم کار تھے۔ آپ نے پینتالیس کتابیں ملیالم زبان میں تصنیف کیں۔ علاوہ ازیں ٹی-وی-کچی باوا نے تیئس کتابیں (ناول اور افسانوں کے مجموعے) رقم کیں۔

قرآن مجید کا مروجہ ملیالم ترجمہ پہلی بار ۱۹۵۳ء میں دکم پی- محی الدین (متوفی ۱۹۶۷ء) نے کیا۔ مولانا ساجر فاضل باقوی (ولادت ۱۹۸۴ء) نے مشہور زمانہ عربی نعتیہ "قصیدۂ بردہ" کی دو جلدوں میں بزبان ملیالم شرح لکھی۔ غرض مذکورہ بالا تاریخی حقائق سے یہ واضح ہو جاتی ہے کہ ملیالم زبان و ادب کی ترقی میں مسلمانوں کا تعاون غیر معمولی ہے۔

جنوبی ہند کی دراویڈ زبانوں میں سے تمل اور ملیالم کے بعد قدیم زبان کنڑ ا ہے، یہ زبان تقریباً

ڈھائی ہزار (۲۵۰۰) سالہ لسانی روایات کی اَمین رہی ہے، مگر اس کی پہلی تحریر چار سو پچاس (۴۵۰) عیسوی میں حلمیدی کتبوں(Halmidi Inscriptons) سے حاصل ہوئی۔ یہ سنگین کتبے صوبہ کرناٹک کے مشہور شہر ہاسن(Hassan) میں بہ سال ۱۹۳۹ء دریافت ہوئے۔ جنوبی ہند کی اولین خود مختار "بہمنی حکومت" (۱۳۴۷ء تا ۱۵۳۷ء) کے بعد عادل شاہی سلطنت کے آٹھویں حکمراں سلطان علی عادل شاہ ثانی (عہد ۱۶۵۶ء تا ۱۶۷۲ء) نے دکنی اور فارسی کے ہمدوش کنڑا کو بھی خوب پھولنے پھلنے کا موقع فراہم کیا۔ چونکہ عادل شاہی سلطنت کے پایہ تخت بیجاپور کی قدیم زبان کنڑا تھی، مسلمان قلم کاروں نے عوامی رجحان کے مدنظر اشاعت دین کے مقصد کے علاوہ خالص ادبی طور پر انسانیت واخلاق کے مسائل کو یکجا کرتے ہوئے کنڑا زبان میں بہترین نظمیں کہی ہیں۔ اس دور میں ایک جید عالم دین، بلند پایہ صوفی حضرت سید شرف الدین شاہ خلیلی نے سب سے پہلے کنڑا زبان میں بہترین نظمیں کہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے کنڑا زبان میں اس قدر اعلیٰ شاعری کی جسے صدیوں بعد بھی کنڑا ادب کی تاریخ فراموش نہیں کرسکی ہے۔ آپ کی نظموں کا مجموعہ "خلالی پڈگالو"(Khilali Padagalu) کے نام سے مشہور ومقبول ہوا ہے۔

کنڑا زبان کے باقاعدہ اور معتبر ومستند مسلمان شاعر جنہیں "کرناٹک کا کبیر داس" کہا جاتا ہے، محمد شریف ابن امام صاحب مشہور بہ شیشو نال شریف (۱۸۱۹ء-۱۸۸۹ء) ہیں۔ ان کو کنڑا مسلم شعر و ادب کا بانی تسلیم کیا گیا ہے۔ آپ کی نظموں کا مجموعہ " تتواپدا"(Tatvapada) اس قدر مشہور ہے کہ کنڑا کے نامور گلوکاروں نے اس مجموعے کی نظموں کو گا کر خود کو شہرت کے آسمان پر پہنچادیا۔ شیشونال شریف پر سنہ ۱۹۹۰ء میں فلم بھی بنائی گئی۔ کنڑاّزبان کے کئی مسلم شعرا نے کنڑا ادب کے خزانے میں غیر معمولی اضافہ کیا۔ انہیں میں سے ڈاکٹر ایس-کے-کریم خاں (۱۹۰۸ء-۲۰۰۹ء) ہیں۔ انہوں نے دوسو (۲۰۰) فلمی گیت، اسّی (۸۰) ڈرامے اور پچیس (۲۵) فلمی کہانیاں لکھیں۔

حکومت ہند کا باوقار اعزاز "پدم شری" خطاب یافتہ اولین مسلم قلمکار ڈاکٹر ایس-کے-شاراحمد (۱۹۳۶ء-۲۰۲۰ء) تھے۔ انہیں "راجیوتسوا ایوارڈ" سے بھی سرفراز کیا گیا تھا۔ آپ کنڑا کے جدیدیت پسند شاعر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ آپ کی معرکہ آرا نظم "نتیوتسوا" (Nityotsava) اس قدر مقبول ہوئی کہ حکومت کرناٹک نے اسے سرکاری نظموں میں شامل

کر لیا۔ دور حاضر میں کنڑ ادب کے مایہ ناز شخصیتوں میں جناب عبدالرشید (ولادت ۱۹۶۵ء) کا نام نمایاں ہے۔ آپ ناول نگار، شاعر و ادیب ہونے کے علاوہ دیانت دار صحافی بھی ہیں۔ کنڑ ادب کی ایک اور اہم ترین قلم کار بانو مشتاق صاحبہ (ولادت ۱۹۸۰ء) ہیں، جنہیں حال ہی میں ادب کے اعلیٰ ترین بین الاقوامی ایوارڈ "بوکر پرائز" (Booker Prize) سے نوازا گیا ہے۔ آپ کی بارہ کہانیوں کا انگریزی ترجمہ دیپا بھاتی نے کیا ہے۔ حکومت کرناٹک نے بانو مشتاق کے ہاتھوں عالمی شہرت یافتہ "دسہرا" تہوار کا افتتاح کر کے آپ کو خراج تحسین پیش کیا۔

کنڑ شعر و ادب میں حقوق نسواں کے لئے جدوجہد کرنے والی مسلم خاتون ڈاکٹر کے-شریفہ صاحبہ (ولادت ۱۹۵۷ء) ہیں۔ کنڑ ادب کی تنقید میں جس نے اپنا نام اور کام مستحکم کیا ہے وہ ہیں کے-ایم- رحمت اللہ معروف بہ رحمت تری کرے (ولادت ۱۹۵۹ء) ہیں۔ کنڑ ازبان میں قرآنِ مجید کا اولین ترجمہ "پوترا قرآن" (Pavitra Quran) کے عنوان سے سنہ ۱۹۵۰ء میں منظر عام پر آیا تھا، اس کے مترجمین تین ماہرین تھے، ان میں پہلا نام "کنڑ اکلا کوی آر-اے- کیسری (R.A. Kesari) کا ہے، دوسرا نام محمد ولی اللہ بی-اے، ایل ایل بی اور تیسرا نام کلیم الملک سید غوث محی الدین (متوفی ۱۹۸۰ء)، مدیر روزنامہ "الکلام" بنگلور، کا ہے۔ ان کے دادا سپہ سالار ٹیپو سلطانؒ سید عبدالغفار شہید (شہادت ۱۷۹۹ء) ہیں۔ کلیم الملک ہی کی سربراہی میں قرآن مجید کے ترجمہ کا کام ہوا تھا۔

کنڑ ازبان کے مایہ ناز مترجمین میں ڈاکٹر ماہر منصور (ولادت ۱۹۴۲ء) کا نام مشہور و ممتاز ہے، آپ نے کنڑ ازبان کے مستند و معتبر ادبا و شعرا کی پینتالیس (۴۵) کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، جن میں پانچ گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ قلم کار ہیں۔ علاوہ ازیں آپ نے کنڑ اکے دو ہزار پانچ سو (۲۵۰۰) وچنوں (مختصر اصلاحی نظموں) کا ترجمہ بعنوان "وچن" کیا ہے۔ اسی طرح اردو کے بلند پایہ شاعر جناب حمید الماس (۱۹۳۵ء-۲۰۰۲ء) نے "بساویشورا" (Basaveshwara) کے ایک سو آٹھ (۱۰۸) وچنوں (Vachanas) کا منظوم ترجمہ "فرمودات" کے نام سے کیا تھا، کنڑ اترجمہ نگاروں میں جناب خلیل مامون (متوفی ۲۰۲۴ء)، پروفیسر اعظم شاہد، ڈاکٹر شاکرہ خانم، ڈاکٹر تسنیم، جناب شاد باگل کوٹی قابل ذکر ہیں۔

جنوبی ہند کی دراویڈ زبانوں میں چوتھی زبان تلگو ہے، اس زبان کی لطافت و نزاکت کے سبب

اسے "اٹالین آف دی ایسٹ" Italian of the East کہا جاتا ہے۔ ماہرین لسانیات کے اندازے کے مطابق تلگو زبان دو ہزار (۲۰۰۰) سال پہلے وجود پذیر ہوئی، مگر اس کے تحریری شواہد ۵۷۵ عیسوی میں کلاملا Kalamalla اور یراگوڈی پاڈو Yarragudipadu میں کھدائی کے دوران دریافت شدہ سنگی کتبوں سے حاصل ہوئے ہیں۔ تلگو زبان کا اولین شاعر و مصنف ننیا بھٹو (۱۰۲۲ء-۱۰۶۳ء) ہے، جسے "آدی کوی" کا لقب دیا گیا ہے۔

تلگو زبان کے اولین مسلم شاعر بعض محققین کی رائے میں قطب شاہی سلطنت کا حکمراں سلطان ابراہیم قطب شاہ (عہد ۱۵۵۰ء تا ۱۵۸۰ء) ہے، جس نے تلگو اور سنسکرت زبانیں نہ صرف سیکھیں بلکہ اپنے دربار کے شعرا سے ادب اور شاعری پر بحث بھی کرتا رہا۔ اس مباحثے کے دوران سلطان کی زبان سے تلگو کے موزوں جملے جنہیں اشعار سے تعبیر کیا گیا ہے، بے ساختہ نکلتے رہے۔ مگر تحقیقی اعتبار سے تلگو زبان کا اولین مستند و معتبر شاعر و ادیب ڈاکٹر عمر علی شاہ (۱۸۸۵ء-۱۹۴۵ء) ابن مولانا محی الدین بادشاہ ہے، جسے اہل علم "کوی شیکھر" Kavi Shekhar کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ عمر علی شاہ نے تلگو زبان میں ایک سو آٹھ (۱۰۸) کتابیں نظم و نثر میں تصنیف کیں۔

تلگو شاعری میں ممتاز مقام حاصل کرنے والے پدم شری شیخ ناجر (۱۹۲۰ء-۱۹۹۷ء) براکتھا پتا مہوڈو Father of Folk art کے لقب سے مشہور ہوئے ہیں۔ ان کو ۱۹۸۶ء میں "پدم شری" ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ آپ نے لوک گیتوں کے فن پر کئی کتابیں لکھیں، ایڈوکیٹ بڈھن صاحب (ولادت ۱۹۳۵ء تقریباً) نے قطب شاہی عہد کی منظوم تاریخ "قطب نامہ" کے عنوان سے ۱۹۶۵ء میں تحریر کی جسے میسور یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات کے نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔

مسلمانوں نے تلگو زبان میں شعر و سخن کے مجموعے شائع کئے اور افسانوں اور ناولوں پر مشتمل کتابیں تحریر کیں۔ ان سب کے علاوہ مسلمان اہل قلم نے ایسے فنون پر بھی قلم اٹھایا جسے عام طور پر مسلمانوں کا فن نہیں سمجھا جاتا ہے۔ ان میں ہندوستان کا قدیم فن ورزش "یوگا" Yoga ہے۔ یوگا کے فن پر تلگو زبان میں سے پہلی کتاب رقم کرنے والا شخص شیخ محی الدین باچھا (۱۹۳۶ء- ۲۰۰۰ء تقریباً) ہے، آپ نے یوگا کی تاریخ اور اس کے مختلف آسنوں اور طریقوں پر مستقل مضامین لکھے اور یوگاسنالو Yogasanalu کے نام سے کتاب شائع کی۔

تلگو زبان کے ممتاز و معروف قلمکاروں میں ڈاکٹر سید محبوب (۱۹۳۸ء-۲۰۰۸ء) ہیں، جنہیں

پلناٹی سری سری Palnati Sree Sree کا لقب دیا گیا ہے۔ بلند پایہ ناول نگار و افسانہ نویس محمد نفیس الدین (ولادت ۱۹۴۰ء)، اردو اور تلگو میں جدید رجحانات کے شاعر ڈاکٹر ساغر جیدی (۱۹۴۱ء-۲۰۱۳ء)، جدید افسانہ نگار شیخ حسین معروف بہ ستیاگنی (Satyagni)(ولادت ۱۹۴۳ء)، مایہ ناز صحافی و فلم کہانی کار محبوب خاں "سگم بابو" (ولادت ۱۹۳۴ء)، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں تلگو زبان کے استاد پروفیسر شیخ مستان (۱۹۵۲ء)، جدوجہد آزادی کی تاریخ کے محقق سید نصیر احمد (ولادت ۱۹۵۵ء)، معروف شاعر و صحافی رحمت اللہ سسی سری (Sasi Sree) متوفی ۱۹۱۵ء، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مضمون کے آخر میں ایک انوکھی بات بتائی ہے کہ قرآن مجید کا تلگو زبان میں اولین ترجمہ سنہ ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا۔ ترجمہ نگار ماہر لسانیات چلاکوری ڈاکٹر نارائن راؤ Dr. Chilakori Narayana Rao(۱۸۹۰ء-۱۹۵۲ء) ہیں۔ اس کے بعد مولانا محمد قاسم خاں (متوفی ۱۹۶۳ء) نے دس پاروں کا ترجمہ کر کے ۱۹۴۵ء میں شائع کیا، پھر اس کے چار سال بعد مولانا عبدالغفور (متوفی ۱۹۶۹ء) نے مکمل قرآن مجید کا ترجمہ کر کے ۱۹۴۹ء میں شائع فرمایا۔

دارالمصنّفین کا لائف ممبر بنئے

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی ملت اسلامیہ کا ایک بے نظیر علمی و تحقیقی ادارہ ہے۔ اس نے سیرت نبویؐ اور مختلف علوم وفنون پر بیش بہا لٹریچر فراہم کیا ہے۔ پچھلی ایک صدی کے دوران دارالمصنفین نے اب تک پونے تین سو کے قریب تصنیفات وتالیفات ملک کے سنجیدہ علمی حلقوں میں پیش کی ہیں۔ ادارے کے ماہنامہ ترجمان علمی "معارف" ملک وملت کی ذہنی وفکری بیداری میں نمایاں کردار ادا کر رہا ہے۔ دارالمصنفین کی بقا اور ترقی ملت اسلامیہ کے مصالح علیا میں شامل ہے۔ دارالمصنفین کے مشن سے جڑنے کا ایک طریقہ لائف ممبری قبول کرنا ہے۔ لائف ممبر شپ کی فیس پچاس ہزار روپے ہے۔ ہر لائف ممبر کو سیرۃ النبیؐ کی سات جلدوں کا سٹ پیش کیا جاتا ہے نیز رسالہ "معارف" بھی تاحیات جاری کیا جائے گا۔ دارالمصنفین کے حیاتی رکن بن کر اس تہذیبی مشن میں شامل ہوں۔

Darul Musannefin Shibli Academy

Shibli Road, Azamgarh 276001, U.P.

Contact: +91-81279-45267 (office). **Email:** info@shibliacademy.org

A/C Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH.

A/C No: 0504010100032752. **Bank Name:** PUNJAB NATIONAL BANK.

Branch: HEERPATTI - AZMAGARH (U.P.). **IFSC:** PUNB 0476100.

Bank Code: 476100

رواداری اور امن کے قیام میں بنگال کے مسلم سلاطین کا کردار

ڈاکٹر کمال اشرف

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ دینیات، عالیہ یونیورسٹی، کولکاتا

kamalashraf9834@gmail.com

ایک اسلامی ریاست میں آباد غیر مسلم کی عزت نفس اور جان و مال کی حفاظت کرنا مسلمانوں پر بالعموم اور اسلامی ریاست پر بالخصوص فرض ہے۔ اسلامی مملکت میں غیر مسلم باشندوں کو وہی حقوق حاصل ہیں جو مسلمانوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے پہلا حق امن و امان اور حفاظت جان و مال ہے۔ یہ حق انہیں ہر قسم کے خارجی اور داخلی ظلم و زیادتی کے خلاف حاصل ہوتا ہے، تاکہ وہ مکمل طور پر آزادی اور امن و سکون کی زندگی بسر کر سکیں۔

متحدہ ہندوستان کے طول و عرض پر تقریباً آٹھ سو سال تک کئی مسلم خاندانوں نے حکومت کی ہے اور ہر خاندان سے تعلق رکھنے والے بادشاہوں نے ہندوستان کے تاج زرنگاہ میں نت نئے گل بوٹوں کا اضافہ کیا ہے۔ رواداری اور وسعت ظرفی کا مظاہرہ کرنا اور پر امن بقائے باہم اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی فضا کو برقرار رکھنا ان کی حاکمانہ زندگی کا طرۂ امتیاز تھا۔ ان کی حکومت میں ہندو، مسلم یا سکھ، عیسائی کی کوئی مذہبی یا نسلی تفریق نہیں تھی۔ انہوں نے کثرت میں وحدت سے عبارت یہاں کی گنگ و جمن تہذیب اور بھائی چارہ کے تصور کو فروغ دینے میں کسی طبقاتی یا مذہبی تعصب کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔ عہد وسطی میں مسلم حکمرانوں نے امن و آشتی اور صلح صفائی کی روش کو روبہ عمل لاتے ہوئے جس اعلی ظرفی کے ساتھ حکومت کی، وہ ہندوستان کی تاریخ کا ہی نہیں بلکہ عالمی تاریخ کا بھی ایک روشن باب ہے۔

سرزمین ہند سے ان مسلم حکمرانوں کی اٹوٹ محبت کا اندازہ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ ایک بار قدم رکھنے کے بعد انھوں نے اپنے آباءواجداد کے مسکن و مدفن اور جائے پیدائش کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا، بلکہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان کے اخلاف و اولاد اور آنے والی نسلوں نے بھی اسی خاک میں جنم لیا اور یہاں کی مٹی کا آخری آرام گاہ کے طور پر انتخاب کیا۔ مسلم بادشاہ عرب

وترکی، افغانستان و ایران سے آئے تھے، لیکن کسی نے بھی اس ملک کو عربستان، ترکستان اور افغانستان بنانے کی کوشش نہیں کی، بلکہ وطن عزیز کی وحدت اور سالمیت کو ایک جاں باز اور وفادار سپاہی کی طرح تحفظ فراہم کیا۔ انہوں نے اس خطۂ زمین سے اپنے مادر وطن کی طرح پیار کیا۔ انہوں نے جہاں اسلامی تہذیب و ثقافت کی، جو صحیح معنوں میں انسانیت، شرافت و اعلی ظرفی اور انسانی اقدار سے عبارت تھی، ترقی و توسیع کی اور تبلیغ کو مذہبی فریضہ کے تحت انجام دیا، وہیں رواداری، امن وآشتی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور خوشگوار برادرانہ تعلقات کا عملی مظاہرہ بھی پیش کیا۔ انہوں نے آج کے حکمرانوں کی طرح ذات پات، اونچ نیچ، چھوا چھوت اور مذہبی خطوط پر نظام حکومت قائم نہیں کی، بلکہ ان کی حکومت عدل وانصاف، مؤدت ومحبت، بھائی چارگی اور انسانی مساوات کی اعلی اقدار پر قائم تھی۔

ہندوؤں کے تہذیبی اور معاشرتی وجود سے انہیں کسی بھی درجے میں نفرت نہیں تھی۔ وہ مختلف اقوام وملل کا پاس ولحاظ اور ان کے حقوق ومطالبات کا پورا احترام کرتے تھے۔ ان کے دوران حکمرانی میں شہریوں کے مابین قومی یک جہتی کا تصور بدرجۂ اتم موجود تھا۔ سماجی مساوات اور قانونی ومعاشی انصاف نظامہائے حکومت کی اساس تھی۔[1]

اس کے برعکس اسلام دشمنی میں بعض عیسائی اور ہندو مؤرخین نے ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے خلاف زہر افشانی کی ہے جس سے عوام الناس یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ان سلاطین میں برائیوں کے سوا کوئی خوبی نہیں تھی، حالانکہ اصل واقعہ کچھ اور تھا۔ ہندوستان میں مسلمان آباد ہوئے تو شاید ہی کوئی ایسی جگہ ہو جہاں ان کے پڑوسی غیر مسلم نہ ہوں، اس لئے کہ ہندوستان ایک کثیر مذاہب، کثیر ثقافتی اور کثیر لسانی ملک ہے، روز مرہ کی زندگی میں ان سب سے سابقہ رہا۔ مسلمان حکمرانوں کے عہد میں صرف لڑائیاں ہی نہیں ہوتی رہیں بلکہ ان کے یہاں رواداری، فراخ دلی اور انسان دوستی بھی رہی اور مسلمانوں کا یہ عقیدہ بھی رہا کہ حکومت الحاد، بے دینی، کفر اور شرک کے ساتھ تو عرصۂ دراز تک قائم رہ سکتی ہے، مگر ظلم اور چیرہ دستی سے برقرار نہیں رہ سکتی، اس لئے مسلمان فرماں رواؤں نے ہر زمانے میں عدل و انصاف پر زور دیا۔ یہ عدل و انصاف پروری، رواداری اور توسع کے بغیر عمل میں نہیں آسکتی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ جتنی

[1] خواجہ محمد اکرام الدین، عہد وسطی میں مسلم حکمرانوں کی رواداری (ای میگزین) اجراوی ابرار، دہلی، امارچ، ۲۰۱۳

قدیم ہے، بنگال کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے:

بنگال میں آٹھویں صدی کے پال خاندان کے پال اول کے بعد تیرہویں صدی کے سین خاندان تک حکمرانی رہی ہے۔ چودھویں صدی میں بنگال سلطنت کے قیام اور پھر اس کے بعد الیاس، با یزید، حابس اور حسین خاندان کے مختلف سلاطین سے ہوتے ہوئے اٹھارہویں صدی میں نواب سراج الدولہ تک ارض بنگالہ پر کم و بیش پانچ سو سال تک کسی نہ کسی طرح مسلمان حکمراں رہے۔ شمالی ہند کے سوری خاندان سے لے کر غیاث الدین بہادر شاہ دوم اور داؤد نے بھی بنگال پر طویل حکمرانی کی۔ سراج الدولہ کی معزولی کے ساتھ ہی بنگال دھیرے دھیرے مسلمانوں کے ہاتھ سے پھسلتا گیا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ کثیر مسلم آبادی والا یہ خطہ کئی ٹکڑوں میں منقسم ہو گیا۔ بہار اور اڑیسہ تو ہندوستان کی ریاستیں بن گئیں، لیکن میانمار اور بنگلہ دیش آزاد ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر طلوع ہوئے۔ اس دوران بغاوتیں ہوئیں، سیاسی تحریک چلی جو ایک الگ قصہ ہے[۲]۔

نوابین بنگال کے پورے عہد کا معاشرتی اور تمدنی تجزیہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ان کے زمانے میں مشترکہ تہذیب و تمدن اپنے عروج کو چھو رہا تھا۔ ایک طرف اگر اسلام کے ماننے والے غیر مسلموں (خصوصاً ہندو) کی تہذیب کا اثر قبول کر رہے تھے تو دوسری طرف نومسلمین کی تعداد بھی بڑھ رہی تھی۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں نواب مرشد قلی خان نے دریائے بھاگیرتھی کے کنارے سنہ ۱۷۰۴ء میں اپنے نام سے منسوب ایک عظیم الشان شہر "مرشد آباد" بسایا جو بعد کے دوسرے نوابوں کا پایۂ تخت باقی رہا۔ مذہبی اور ثقافتی امن امان اور ہم آہنگی کا ایک رجحان تھا جہاں ہندو اور مسلمان ایک ساتھ رہتے تھے۔ نوابین بنگال کے دور میں مذہبی رواداری، سماجی اور معاشرتی ہم آہنگی کی روایات اور امن و امان کا منظر دیکھنے میں آیا۔ مرشد قلی خان نے ایک ایسے معاشرے کو فروغ دیا جہاں مذہبی اور نسلی شناخت مساوی شہری ہونے میں رکاوٹ نہیں تھی۔

مرشد قلی خان (۱۶۶۰-۱۷۲۷): نواب مرشد قلی خان، جن کو محمد ہادی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، کی پیدائش ایک برہمن خاندان میں ہوئی۔ ان کا نام سوریہ نارین مشرا رکھا گیا۔ وہ بنگال

---

[۲] علامہ بشیر اویسی، مسلم ریاست میں غیر مسلم کے حقوق، ۳۱، دسمبر ۲۰۲۱، نیوز اکسپریس، پاکستان

کے پہلے حکمراں (نواب) بنے۔

جب کوئی حاکم خود مختار ہو جائے تو وہ غیروں کے ساتھ غیر جانب داری کا معاملہ نہیں کرتا ہے، بلکہ دوسرے مذاہب والوں کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھتا ہے مگر نواب قلی مرشد خان کی طرز حکمرانی بالکل اس کے برعکس تھی۔ انہوں نے رعایا میں مذہب کی بنیاد پر کسی بھی طرح کا امتیازی سلوک نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے دور حکومت میں مسلموں کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں کو بھی حکومت کے تمام اہم شعبوں میں ذمہ داریاں تفویض کیں۔ گڈ گورننس کے لئے یہ بہت اہم نکتہ ہے کہ حاکم اپنی رعایا کے درمیان مذہبی، علاقائی اور ذات پات کی بنیاد پر کوئی بھید بھاؤ قطعی نہ کرے۔ نواب قلی مرشد خان نے اس اہم نکتے کو بخوبی نبھایا اور اپنے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے صلاحیت کو معیار مانا۔ ہسٹری آف بنگال میں مذکور ہے:

> نواب مرشد قلی بنگال کے پہلے خود مختار نواب تھے، جنہوں نے اپنے دور حکومت میں غیر مسلم 'ہندو' اور مسلم دونوں مذاہب کے باصلاحیت لوگوں کو حکومت کے اہم عہدوں پر فائز کیا۔ ان کے محکمۂ مالیات میں اکثریت ہندو کائستھ اور ویدیہ افسران فائز تھے۔ جگت سیٹھ کا خاندان ان لوگوں میں شامل تھا جنہیں نواب مرشد قلی خان کے دور میں مالیاتی امور کے اہم عہدوں پر فائز کیا گیا تھا۔ ہندو مسلم باہم مل کر اہم اقتصادی معاملوں کو سنبھالتے تھے۔ (۳)

نظام محصولات اور دیگر امور: نواب مرشد قلی خان کے عہد میں نظام محصولات اور مالیات کی جدید کاری و ترقی میں مسلمانوں کے ساتھ دیگر مذاہب خصوصاً ہندو دھرم کے ماننے والے بھی مل کر فرائض انجام دیتے تھے۔ ایسے ہی دیگر امور مثلاً زمینداری، مہاجن، کسان سبھی کو اپنے کاموں پر یکساں حیثیت اور آزادی حاصل تھی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ آپسی بھائی چارہ، تعاون، ایک دوسرے کی تقریبات میں شامل ہونا اور رسم و رواج کا باہم احترام و عزت کرنے کا ماحول بن گیا۔ سمت سرکار اپنی کتاب "ماڈرن انڈیا" میں رقمطراز ہیں:

> نواب مرشد قلی خان محصولات کی اصلاح و ترقی کے لئے بہت ہی پیش پیش رہتے تھے، نواب نے نظام محصولات کی اصلاح و ترقی اور وصولی کے لئے مذہب اور دھرم کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں برتا۔ ایسے نظام زمینداری، مہاجن سسٹم، نظام کاشت کاری اور دیگر نظاموں میں سبھی

(۳) *History of Bengal,* University of Dacca, 1813, volume -11 pp. -112-128

دھرموں کے لوگوں کو یکساں حقوق حاصل تھے، کسی کے ساتھ کوئی بھید بھاؤ یا امتیاز نہیں کیا تھا، انہوں نے ہندو مہاجنوں کے رتبے کا خیال کرتے ہوئے ان کے اثر ورسوخ کو تسلیم کیا اور ان کے تعاون سے معیشت کو آگے بڑھایا اور کبھی مذہبی تفریق نہیں کیا۔ (۴)

سماجی ہم آہنگی اور امن و امان: سلاطین بنگال نے ایسے سماجی امن و امان قائم کرنے کے لئے مذہبی اختلافات اور تنازع کو کبھی پنپنے کا موقع نہیں دیا بلکہ بروقت مسئلہ کا حل نکالا، ایک دوسرے کے مذہبی و سماجی رسم و رواج کا احترام کیا اور عوام کو بھی اس کا پاسدار بنایا۔ نواب بذات خود مسلمان تھے لیکن ہندو اور دیگر دھرموں کے مذہبی تقریبات اور پروگراموں پر کوئی پابندی عائد نہیں کی بلکہ ان میں حتی الوسع شرکت بھی کی۔ انہوں نے کلکتہ کے کالی گھاٹ مندر اور ندیا ضلع کے نبدویپ جیسے کئی ہندو تیرتھ استھل (مقامات مقدسہ) کی تعمیر اور تزئین کاری کی۔ (۵)

تہذیب و ثقافت اور بقائے باہمی: ارض بنگالہ میں مسلم نوابوں نے جہاں مساجد و مدارس کے تعاون کے ذریعے اسلامی تہذیب و تمدن کی حفاظت کی، اسی طرح انہوں نے دیگر مذاہب خصوصاً ہندو دھرم، ہندو سنسکرتی، معابد اور تعلیم گاہوں کا خیال رکھا۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ جب نواب مرشد قلی خان نے اپنے نام سے ایک عظیم الشان شہر مرشد آباد بحیثیت دار الحکومت آباد کیا تو اسے مستحکم اور باوقار بنانے کے لئے دور دراز علاقوں سے صنعت کار، فنکار، تجار، کاریگر اور فن و حرفت کے ماہرین کو بلا امتیاز مذہب و ملت دعوت دی۔

ہندو زمینداروں، صنعت و حرفت اور پیشہ وروں کو عزت کے ساتھ مواقع کی فراہمی: ان کے عہد زرّیں میں ایک خوبصورت معاشی و ثقافتی تعددی معاشرہ وجود میں آیا۔ مزید برآں انہوں نے زمینداروں، کاشتکاروں، تاجروں اور دیگر صنعت و حرفت والوں کو عزت و احترام دیا اور ان کے حقوق کا خاطر خواہ خیال رکھتے ہوئے مواقع فراہم کئے تاکہ وہ بلاخوف و تردد اور باوقار طریقے سے اپنے اپنے فرائض کو انجام دے سکیں۔ انہوں نے عوامی فلاح و بہبود کے لئے بازار، سڑکیں، تالاب اور کنویں سب کی سہولت اور استعمال کے لئے تعمیر کرائے۔ آر، سی مجومدار اپنی کتاب ہسٹری آف بنگال میں تحریر کرتے ہیں:

---

(۴) *History of Bengal*, University of Dacca , 1813, pp -115 -117

(۵) Sumit Sarkar, *Modern India*, S. G Wasni, New Delhi, 1959, pp 225-230

نواب مرشد قلی خان نے ہندو زمینداروں اور تاجروں کو محصولات کے نظام میں اہم عہدوں پر عزت و احترام کے ساتھ فائز کیا، تاکہ ہندوؤں کو مذہبی تفریق کا احساس نہ ہو اور وہ بلا جھجک امن امان کے ساتھ اپنے کاروبار کو وسعت دے سکیں نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کا نظام مالیات مستحکم ہوا اور انہوں نے عوامی فلاح کے لئے سڑکیں، کنویں، تالاب اور دیگر عوامی ضروریات کی چیزیں مشترک استعمال کے لئے تعمیر کرائیں، انتظامی امور میں مسلم کے ساتھ غیر مسلموں کی شمولیت سے دونوں طبقے کے درمیان باہمی اعتماد اور تعاون کی فضا قائم ہوئی۔[۶]

مشہور مصنف جان فاریرJohn Farrier اپنی کتاب *An Account of the Nawabs of Bengal* میں نواب مرشد قلی خان کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

نواب بذات خود مسلمان ہوتے ہوئے بھی ہندوؤں اور دیگر مذاہب کے لوگوں کے مذہبی معاملات میں کسی قسم کی کوئی مداخلت نہیں کی بلکہ انہیں بہت عزت و احترام کی نظر سے دیکھا۔ یہی نہیں جہاں بھی ممکن ہوتا وہ ان مذہبی رسومات میں شرکت کرتے، اور بہت سارے مذہبی جگہوں اور تیرتھ استھلوں کی تزئین و ترقی کراتے جیسے، کالی گھاٹ اور نبودیپ.....۔ انہوں نے سماجی ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لئے ایسا ماحول قائم کیا کہ عوام پر امن اور سکون بھری زندگی گزار سکیں، آپسی خلفشار کا امکان ہی ختم ہو جائے۔ اسی طرح نواب نے اپنے وزراء میں نظم وضبط کو بہت سختی سے برقرار رکھا، انصاف کا دامن تھامے رکھا اور تنازعات سے خود کو بچاتا رہا۔

مرشد قلی خان دیندار، متقی اور پرہیز گار انسان تھا۔ اس انصاف پسند نواب نے جہاں مساجد و مدارس تعمیر کروائے وہیں مندروں کی تعمیر بھی کرائی۔ تعددی معاشرہ اسلام اور مسلمان میں مذکور ہے:

ہندو اور مسلمان کے درمیان وہی ہم آہنگی پائی جاتی تھی جو عرصہ دراز سے بنگال کی سرزمیں کا ایک طرۂ امتیاز تھی، اور جس کی بنیاد شیخ جلال تبریزی کے ہاتھوں ۱۲۰۰ء کے آس پاس پڑی تھی۔ شیخ جلال تبریزی نے اپنی علمی و روحانی تعلیمات سے بنگالہ کے عوام کے دلوں کو جوڑنے کا کام کچھ اس طرح انجام دیا کہ ہندو مت کے تانترک برہمنوں نے ان کے اخلاص سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ پنڈوہ، دیوتھل یا بندر طدیو محل اور اس کے گرد نواح میں قائم منادر و معابد نے

---

(۶) R. C. Majumdar, *History of Bengal*, pp. 98 – 102, 1813, The University, Dhaka,
Bengal Nawabs, Sir Jadunath Sarkar, Life Span Delhi, 2021, pp. 209- 213.

خانقاہ و چلہ خانوں کی شکل اختیار کر لی۔ اس کے بعد سینکڑوں بزرگوں کی تعلیمات مساوات اسلامی روحانیت نے یہاں کے مسلم، نو مسلم اور ہندو معتقدین کو ایک دھاگے میں موتیوں کی طرح پرو دیا۔[۷]

نواب سراج الدولہ: مرزا محمد المعروف نواب سراج الدولہ (۱۷۳۳ء- ۲جولائی ۱۷۵۷ء)

بنگال، بہار اور اڑیسہ کے آخری اور صحیح معنی میں آزاد حکمران تھے۔ نواب سراج الدولہ اپنے نانا علی وردی کی وفات کے بعد ۲۳ سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے تھے۔ ان کا دورِ حکمرانی بہت مختصر تھا۔ ۱۷۵۷ء میں ان کی شکست سے بنگال میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کا سورج طلوع ہوا۔ چوبیس سالہ سراج الدولہ کی کمان میں لڑی گئی جنگ پلاسی کا شمار برّصغیر کی ان اہم اور فیصلہ کن جنگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے ہندوستان کی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ اس جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد برّصغیر میں انگریزوں کا ایک سو نوّے سالہ تاریک دور شروع ہوا۔ بنگال کے غداروں کی کارستانیوں سے ۲۳/ جون ۱۹۵۷ء کو صرف چار گھنٹوں میں میدان پلاسی میں رابرٹ کلائیو کے تین ہزار سپاہیوں کے ہاتھوں سراج الدولہ کی تیس ہزار پیادوں، پندرہ ہزار گھڑ سواروں اور چالیس توپوں پر مشتمل ایک قوی فوجی لشکر کو ہار کا سامنا کرنا پڑا۔[۸]

نواب سراج الدولہ نے انگریزوں کی سازشوں کو بے نقاب کیا جو عوام کے لئے نقصاندہ تھیں۔ فیصل عظیم فیصل اپنی کتاب "برّصغیر پاک و ہند پر انگریزوں کا باضابطہ قبضہ ہونے کے دنوں کا ہندوستان" میں رقم طراز ہیں:

> اولاً انگریزوں نے فورٹ ولیم (قلعہ ولیم) کی دیواریں پختہ اور مزید اونچی کیں جو معاہدوں کی صریح خلاف ورزی تھی۔ دوم انگریزوں نے بنگال کے کچھ ایسے افسران کو پناہ دی جو ریاست کے خزانے میں خرد برد کے مجرم تھے۔ سوم انگریز خود بنگال کسٹم ڈیوٹی میں چوری کے مرتکب تھے۔[۹]

---

[۷] تکثیری معاشرہ۔ اسلام اور مسلمان، ڈاکٹر افتخار، ص ۱۵۵- ۱۵۶، شعبہ اسلامک تھیالوجی، عالیہ یونیورسٹی، کولکاتا، ۲۰۱۵، ص ۱۵۴- ۱۵۵

[۸] انگریزوں اور سراج الدولہ کے درمیان فیصلہ کن جنگ بحوالہ آزاد دائرۃ المعارف (آن لائن)

History of the Muslims of Bengal, Imam Muhammad Ibn Saud Islamic University.

[۹] فیصل عظیم فیصل، "برصغیر پاک و ہند پر انگریزوں کا باضابطہ قبضہ ہونے کے دنوں کا ہندوستان"، اردو محفل (میگزین) ۱۶ مئی ۲۰۲۲ء

ایس، ایچ قادری اپنی کتاب ''سراج بنگال'' میں لکھتے ہیں:

نواب سراج الدولہ اور انگریزوں میں شدید اختلاف کی فضا پیدا ہو گئی۔ جب رنگے ہاتھوں ٹیکس اور کسٹم کی چوری پکڑی گئی اور انگریزوں نے معاہدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کلکتہ میں اپنی فوجی قوت بڑھانا شروع کی تو نواب سراج الدولہ نے جون سترہ سو چھپن عیسوی میں کلکتہ میں انگریزوں کے خلاف کارروائی کرتے ہوئے متعدد انگریزوں کو قانون کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے قید کر لیا۔ (۱۰)

انتظامی امور میں ہندو مسلم اتحاد اور معاشی تعاون: نواب سراج الدولہ نے مذہبی ہم آہنگی اور انتظامی امور میں غیر جانب دارانہ روش اختیار کی۔ انہوں نے کسی بھی مذہب کے معاملات میں مداخلت نہیں کی۔ اس بات کی وضاحت صدیق الرحمان اپنی کتاب '' نواب بانگلار ابھیجات سرینی'' میں کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

نواب سراج الدولہ نے کسی بھی دھرم، ذات، فرقہ اور پنتھ کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کی اور نہ کسی کو کرنے کی اجازت دی، تاکہ عوام پر سکون زندگی گزار سکیں، ان کے دور نوابی میں کلکتہ کے کالی گھاٹ مندر میں ہندوؤں کی آزادانہ پوجا ہوتی تھی، کسی بھی طرح کی مداخلت حکومتی سطح پر نہیں کی جاتی تھی اور نہ کسی کو کرنے کی اجازت دی جاتی تھی۔ نیز ان مندروں اور مٹھوں کو سرکاری خزانے سے زمین، سونا چاندی اور روپے عطا کئے جاتے تھے تاکہ مندر کے انتظامات پر خرچ کیا جا سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ مساجد و مدارس اور خانقاہوں میں بھی تقریباً ایسا ہی ماحول تھا۔ نواب کے دربار میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو افسران کی ایک بڑی تعداد اہم عہدوں پر فائز تھی مثلاً راج بلبھ (ہندو داروغہ) جگت سیٹھ مادھو داس (وزیر خزانہ) حکومت میں کلیدی کردار ادا کرتے تھے۔ نواب سراج الدولہ کے زمانے میں ہندو اور مسلم تاجروں میں بھائی چارہ اس قدر رچ بس گیا تھا کہ دونوں کلکتہ اور ہگلی کی منڈیوں میں مل جل کر تجارت کیا کرتے تھے اور ایک دوسرے کی ہر وقت مدد و تعاون کے لئے تیار رہتے تھے۔ انہوں نے انگریز تاجروں کو یکطرفہ مدد نہ دے کر ہندو اور مسلم تاجروں کی مدد کی اس سے یہ فائدہ ہوا کہ ہندو مسلم تاجروں نے اپنے مفادات کی حفاظت کی۔ (۱۱)

---

(۱۰) سراج بنگال (مراۃ العارفین۔ میگزین) مصنف ایس، ایچ، قادری، جون ۲۰۱۵، ص ۱

(۱۱) Saddikur Rahman, *Nawab Benglar abhijat sreni*, Publisher Asiatic society of Dhaka, 2020, pp.132-135.

غیر ملکی ظلم کے خلاف اتحاد: مؤرخ عبد الکریم تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں خصوصاً بنگال کی نوابی تاریخ پر ان کا گہرا مطالعہ ہے۔ وہ اپنی کتاب *Mursid Kuli Khan and his time* میں رقمطراز ہیں:

> نواب سراج الدولہ اپنی رعایا کی تکلیف و بے سکونی نہیں برداشت کر سکتے تھے یہی وجہ ہے کہ ایک موقع پر جب انگریزوں نے فورٹ ولیم کی توسیع کے لئے ہندو اور مسلم گھروں کو گرادیا تو نواب سراج الدولہ نے فوراً احتجاج کرتے ہوئے کہا: "رعایا کے گھروں کو گرا کر انہیں اذیت اور تکلیف دینا ظلم اور زیادتی ہے" یعنی اپنی حکومت کمزور ہونے کے باوجود انہوں نے ظالم قوم سے اپنی رعایا کی تکلیف کو محسوس کرتے ہوئے احتجاج کیا اور حکم دیا کہ ہندوستانیوں (ہندو، مسلم) کی جائداد کو تحفظ فراہم کیا جائے۔[۱۲]

امن امان اور غیر جانبدارانہ ماحول: نواب سراج الدولہ کے تخت نشین ہونے کے بعد ہی ان کی کوشش تھی کہ ملک میں کسی بھی طرح امن امان اور سکون کی زندگی رعایا کو حاصل ہو۔ ان کا ماننا تھا کہ خطے میں امن و سکون نہ ہو تو کوئی ملک یا علاقہ ترقی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے مذہبی تفریق کئے بغیر نظم و نسق اور حکومت کے ہر شعبے میں غیر جانبدارانہ رویہ اپنایا۔ جان فارپر اپنی کتاب *An Account of the Nawabs of Bengal* میں لکھتا ہے:

> نواب سراج الدولہ نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی بدعنوان لالچی افسران کو برطرف کرتے ہوئے قید کر دیا۔ کچھ محصول لینے والے افسران رعایا سے زیادتی کرتے تھے اور ناجائز ٹیکس وصول کرتے تھے۔ انہوں نے ان کو سزا دے کر عوام کو راحت پہنچانے کا کام کیا۔"[۱۳]

سماج دشمن عناصر پر قابو: بادشاہ وقت کے فرائض میں یہ بات شامل ہوتی ہے کہ وہ اپنی رعایا کے ہر دکھ درد اور تکلیف کو محسوس کر کے اس کا مداوا کرے اور یہ خوبی بنگال کے مسلم حکمرانوں میں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ بنگال کے کچھ علاقوں میں جب بھی لٹیروں، ڈاکوؤں اور سماج دشمن

---

(۱۲) Abdul Karim, *Mursid kuli Khan and his time*, Asiatic Society of Pakistan, East Pakistan, 1960-1961, p. 234

(۱۳) Sir Jadunath Sarkar, *Bengal Nawabs, Life Span*, (Rakesh Pruthi), Delhi, 2021, pp. 209-213.

عناصر نے بد امنی اور سماج میں بے سکونی پیدا کرنے کی کوشش کی تو نواب سراج الدولہ نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ سخت کارروائی کر کے قصوروا روں کو سزا دی جائے، اور ایسا ہی ہوا، ڈاکوؤں اور سماج دشمن عناصر کو کیفر کردار تک پہنچایا گیا۔ سشیل چودھری اپنی کتاب *The Prelude to Empire* میں تحریر کرتے ہیں:

> بنگال کے مختلف علاقوں خصوصاً ندیا اور ہگلی میں ڈاکوؤں اور لٹیروں نے لوٹ مار اور عوام کی گاڑھی کمائی کو بے خوف لوٹنے اور چھیننے کا وطیرہ بنالیا تھا تو فوراً نواب وقت نے ان ظالموں اور مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا اور عوام کو راحت و سکون بھری زندگی نصیب ہوئی۔ کئی جگہوں پر انگریز عام لوگوں کو بلاوجہ پریشان کرتے تھے، اس کو بھی نواب کی سختی نے ختم کیا۔ یہ اقدام دراصل غیر ملکی طاقت اور ظلم روکنے اور ارض بنگالہ میں سکون واطمینان، امن وشانتی اور نظم ونسق برقرار رکھنے کی ایک بہت بڑی مثال تھی۔ (۱۴)

نواب شجاع الدین: شجاع الدین محمد خان کا دور حکومت سترہ سو عیسوی ہے۔ کچھ ماہ ان کی حکومت رہی۔ ان کے بارے میں تفصیل نہیں ملی، تاہم ڈاکٹر افتخار تحریر کرتے ہیں:

> مرشد قلی خان کی وفات کے بعد شجاع الدین نے سلطنت کے کام کو آگے بڑھایا۔ اس نے ایک دار الشوری قائم کیا تھا جس میں حاجی احمد اور مرزا محمد کے ساتھ رائے عالم چند اور جگت سیٹھ جیسے قابل ہندو بھی خاص اراکین تھے۔ شجاع الدین نے اپنے داماد مرشد خان کو صوبہ اڑیسہ کا نائب دیوان مقرر کیا تھا، جس نے سابق نائب ناظم کی غلطیوں کی اصلاح کی۔ شجاع الدین خان نے مرشد قلی خان کے عہد کے کارندے جسونت رائے کو ڈھاکہ کی دیوانی اس مقصد کے تحت عطا کی تاکہ اس شہر کی رونق دوبارہ لوٹائی جا سکے، اور ہوا بھی ایسا ہی کیونکہ رائے نے بلا امتیاز مذہب وملت دروازہ سب کے لئے کھلوا دیا تھا۔ ۱۷۳۷ء ماہ اکتوبر کی گیارہویں رات میں ہولناک طوفان کی زد میں تین لاکھ جانیں تلف ہوئیں۔ اس کے دوسرے سال قحط پڑا۔ حاکم نے بلالحاظ مذہب وملت غریبوں اور محتاجوں کی مدد کی۔ مرتے وقت ہندو مسلم اتحاد کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے بیٹے سے عہد وپیمان لیا کہ وہ جگت سیٹھ اور رائے رایان کے ہر مشورے کا احترام کرے گا۔ (۱۵)

---

(۱۴) Sushil Chaudhury, *The Prelude to Empire*, Manohar, New Delhi, 2000, p. 125.

(۱۵) تکثیری معاشرہ۔ اسلام اور مسلمان، ڈاکٹر افتخار، شعبہ اسلامک تھیالوجی، عالیہ یونیورسٹی، کولکاتا، ۲۰۱۵، ص ۱۵۶

نواب علی وردی خان کی مذہبی رواداری: نواب علی وردی متدین شخصیت کے مالک تھے۔ اپنے مذہب پر سختی سے عمل کرتے تھے لیکن انہوں نے کسی بھی مذہب کے ماننے والوں کو ناجائز پریشان نہیں کیا، سبھوں کے ساتھ انصاف، عدل اور رواداری کا مظاہرہ کیا تاکہ ان کی رعایا امن وشانتی اور سکون کے ساتھ پھولے پھلے۔ مشہور مصنف سوبودھ اپنی کتاب میں تحریر کرتے ہیں:

> علی وردی خان فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم کرنے کے لئے بہت کوشش کرتے، ہندو مسلم دونوں فرقوں کو یکساں حقوق اور رعایت سے نوازتے۔ علی وردی مسلم ہونے کے باوجود کبھی بھی ہندو اور دیگر غیر مسلم کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کرتے تھے۔ ایک واقعہ بہت ہی مشہور ہے کہ یہاں کے کچھ دشمن عناصر نے نبدیا (نبدیپ) کے وشنو مراکز میں کرتن اور پوجا پاٹھ کرنے سے روکنے کی کوشش کی تو انہوں نے کہا "وشنو مراکز میں ہندو بغیر کسی مداخلت کے پوجا پاٹ اور اپنی مذہبی سرگرمیاں جاری رکھیں"۔ (۱۶)

نواب علی وردی خان دیگر نوابوں سے زیادہ رعایا پرور تھے، ان کی ہر ضرورت میں مدد اور پریشانی کا مداوا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی سرکار کے انتظامی امور میں انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کو اہم عہدوں پر مامور کیا تاکہ ان کی رعایا امن وشانتی اور بھائی چارے سے اپنی زندگی بسر کرسکیں، سشیل چودھری تحریر کرتے ہیں:

> نواب علی وردی کی حکومت میں بڑے بڑے عہدوں پر ہندوؤں کو فائز کیا تھا جیسے جگت سیٹھ مہاراجہ مادھو داس جنہوں نے مالیات کا شعبہ بحسن وخوبی سنبھالا اور اپنے فرائض کو انجام دیا۔ محصولات کی وصولی، تجارت اور دیگر شعبہ ہائے زندگی میں ہندو اور مسلم دونوں کو یکساں اہمیت اور حقوق عطا کئے گئے۔ علی وردی عوام کی جان ومال، عزت و آبرو، تجارت وعبادت سب کی حفاظت کے لئے کوشاں رہے۔ مرہٹے بار بار حملہ کرتے، گاؤں، کھلیان اور اناج جلا دیتے، قتل وغارت گری کرتے، ذریعۂ معاش تباہ کردیتے، اور مال واسباب لوٹ کرلے جاتے تھے۔ اس سے گاؤں اور دیہات کے لوگ پریشان اور بے حال ہوگئے۔ اس وقت نواب علی وردی خان نے

Narendra Krishna Sinha, *The Economic History of Bengal*, Calcutta, Mokhopadhyay, 1961, p. 315.

(۱۶) Narendra Krishna Sinha , *The Economic History of Bengal*, Calcutta, Mukhopadhyay, 1961, p. 320.

ہندو مسلم اور دیگر مذاہب کے لوگوں کو قلعہ میں پناہ دی، کھانا کپڑا اور زندگی کی تمام ضروریات کو پورا کیا۔ دس سال تک مرہٹوں کے خلاف ہندو مسلم اور دیگر مذاہب کے فوجیوں نے جدوجہد جاری رکھی اور علی وردی نے بنفس نفیس فوج کی قیادت کی اور کامیاب ہوئے۔ ایسے ہی سنہ ۱۷۴۲ء میں کٹوا (بردوان) میں ان ڈاکوؤں کے حملہ کو ناکام کر دیا جس سے پائیدار امن و امان کا سورج طلوع ہوا۔ ان کا اصل مقصد رعایا کو امن و سکون کی زندگی اور ہم آہنگی مہیا کرانا تھا۔ اس کے علاوہ مذہبی تقریبات، پوجا پاٹ اور عیدین کے پروگراموں میں رعایا کی سلامتی، حفظ و امان کے لئے فوج اور انتظامیہ کو خصوصی احکامات دیے جاتے تھے"۔ (۱۷)

مرشد آباد اہل علم و فن کی آماج گاہ: نواب علی وردی علم و فن اور علماء و مذہبی پیشوا کی بہت قدر و عزت کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اگر کسی شخص میں کوئی خوبی یا مہارت ہوتی تو آپ اس کی عزت افزائی حکومت کی طرف سے کرتے۔ یہی نہیں، بلکہ اگر ان کو معلوم ہو جاتا کہ فلاں جگہ ایک ماہر علم و فن شخص موجود ہے، تو ان کو آپ بعزت و احترام اپنے زیر نگیں علاقے میں آنے کی دعوت دیتے اور ان کی ہر ضرورت کا خیال کرتے اور دربار میں خوب اکرام و انعامات سے نوازتے۔ سوبودھ کمار اپنی کتاب "دی اکانومک ہسٹری آف بنگال" میں رقم طراز ہیں:

انہوں نے دارالحکومت مرشد آباد میں اہل علم، فنکار، دیگر ماہرین اور تاجر، کاریگر بلا تفریق ہندو مسلم سب کو مدعو کیا اور کہا کہ یہاں بود و باش اختیار کیجئے اور اپنی مہارت کا جلوہ دکھائے۔ ان کے دور حکومت میں مندروں اور مساجد کی تعمیر ہوئی اور سبھی مذہبی عبادت گاہوں کو تحفظ فراہم کیا گیا۔ نیز ان کی حکمرانی میں کوئی بھی مذہبی چپقلش یا فرقہ وارانہ تصادم نہیں ہوا۔ نواب علی وردی کی سب سے بڑی کامیابی ہے کہ رعایا ان کے زیر نگیں بالکل امن و امان اور سکون و شانتی سے اپنی زندگی گزار رہی تھی۔ (۱۸)

نواب میر قاسم علی خان: ۱۷۶۰ء سے ۱۷۶۳ء تک بنگال کے نواب تھے۔ ان کو برطانوی

---

(۱۷) Narendra Krishna Sinha, Calcutta, Mokhopadhyay, 1961

(۱۸) Narendra Krishna Sinha , *The Economic History of Bengal*, Calcutta, Mukhopadhyay, 1961, p. 322.

ایسٹ انڈیا کمپنی نے میر جعفر کو معزول کر کے نواب بنگال منتخب کیا تھا۔ تاہم جلد ہی نواب میر قاسم بھی انگریزوں کے خلاف ہو گیا جس کے نتیجہ میں سنہ ۱۹۶۴ میں بکسر کی لڑائی ہوئی اور میر قاسم کو شکست ہوئی۔[۱۹]

امن وامان اور مذہبی ہم آہنگی: نواب میر قاسم نرم دل شخصیت کے مالک تھے جنہوں نے عوام کی فلاح وبہبود کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔ رعایا کی بے سکونی، پریشانی ان کی تکلیف کا باعث ہوتا تھا۔ انہوں نے ہندوؤں کو اور مسلمان کو ایک نگاہ سے دیکھا، کوئی تفریق نہیں کی۔ وہ مذہبی معاملات از خود دیکھتے اور سرکاری منتظمین کو ضروری احکامات دیتے تھے۔ انہوں نے رواداری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تاکہ ہندو مسلم اور دیگر مذاہب کے لوگ امن و آشتی اور سکون سے رہ سکیں۔ انہوں نے دوسرے کے مذہب پر بے جا مداخلت نہیں کی۔ ان کی حکومت میں سبھی لوگ اپنی عبادات و رسومات اپنے مذہب کے مطابق ادا کرتے تھے، اور ان کو ان کی عبادات کے لئے تحفظ فراہم کیا جاتا تھا۔ انتظامی امور میں مسلم کے ساتھ ساتھ ہندو بھی کثیر تعداد میں اہم عہدوں پر خدمات انجام دیتے تھے۔ فوجی اعلی حکام میں بھی غیر مسلم (ہندو) کی شمولیت تھی جیسے راج بلبھ جو شعبہ وصولی اور محکمہ مالیات میں نہایت اہم کردار ادا کرتے تھے۔ اس طرح فوج اور دیگر شعبوں میں سب کی حصہ داری تھی جس سے علاقہ میں امن وامان قائم تھا۔ سشیل چودھری اپنی کتاب *The Prelude to Empire* میں تحریر کرتے ہیں:

> نواب میر قاسم بہت ہی نیک دل اور نرم خو انسان تھے۔ گرچہ آپ مسلم تھے لیکن ہندوؤں کے مذہب سے تعلق رکھنے والے امور میں کوئی مداخلت نہیں کرتے اور نہ کسی کو کرنے کی اجازت دیتے تھے۔ بیر بھوم اور ندیا میں کچھ شرارت پسند لوگوں نے پوجا پاٹ میں روک اور نقض امن کی کوشش کی تو انہوں نے بذات خود معاملہ کو سنجیدگی سے لیا اور انتظام وانصرام میں مامور لوگوں کو حکم دیا کہ پوجا پاٹ بلا روک ٹوک ہونی چاہئے۔ ان کے وزراء ہندو مسلم دونوں ہوا کرتے تھے۔[۲۰]

---

[۱۹] ادارہ دائرۃ المعارف *Historyof the Muslims of Bengal*, Imam Muhammad Ibn Saud, Islamic University.

[۲۰] Sushil Chaudhury, *The Prelude to Empire*, Manohar, New Delhi, 2000, p. 329.

منظومات شبلی کی ضبطی

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
azmi408@gmail.com

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ - ۱۹۱۴ء) اردو و فارسی کے نہایت قادرالکلام شاعر تھے۔ ان کی اردو وفارسی دونوں کلیات میں نظمیں، غزلیں، قصائد، مثنوی، مراثی اور قطعات جیسی مختلف اصناف سخن شامل ہیں۔ ان کے کلام کے متعدد مجموعے نظم شبلی، دیوان شبلی، دستۂ گل، بوئے گل، کلام شبلی، تاریخی جواہر، وغیرہ شائع ہوئے۔ ۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء کو ان کا سانحۂ وفات پیش آیا۔اس کے بعد "برگ گل" اور مجموعہ نظم شبلی کے علاوہ مولانا سید سلیمان ندوی(۱۸۸۴-۱۹۵۳ء) نے علامہ شبلی کی اردو وفارسی دونوں کلیات مرتب کرکے دارالمصنّفین سے شائع کیں۔

علامہ شبلی کی شاعری اور شاعرانہ عظمت پر پچاسوں مضامین اور مستقل کتب و رسائل شائع ہو چکے ہیں، البتہ ان کی نظموں کی انگریزی حکومت کی جانب سے ضبطی کے معاملہ کا ذکر صراحت سے کسی نے نہیں کیا ہے۔

مشہور مجاہد آزادی ڈاکٹر مختار احمد انصاری (۱۸۸۰-۱۹۳۶ء) ہندوستان کی جدوجہد آزادی اور انڈین نیشنل کانگریس کے صف اول کے رہنما اور قائد تھے، ۱۹۲۷ - ۱۹۲۸ میں وہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانیوں میں تھے اور ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۶ء تک وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر بھی رہے۔ ان دونوں بزرگوں یعنی شبلی وانصاری میں وطنی قربت بھی تھی۔ علامہ شبلی کا وطن اعظم گڑھ اور ڈاکٹر انصاری کا وطن غازی پور قریب قریب واقع ہیں۔ علامہ شبلی کے غازی پور سے گوناگوں روابط تھے۔ ان کی تعلیم اولاً مولانا محمد فاروق عباسی چریاکوٹی سے مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور ہی میں ہوئی تھی۔

ان دونوں بزرگوں کا سیاسی مذاق اور رجحان بھی یکساں تھا۔ یعنی دونوں انڈین نیشنل کانگریس اور اس کے نظریۂ سیاست کے حامی تھے، البتہ ان میں والہانہ شیفتگی اس وقت پیدا ہوئی جب

ڈاکٹر مختار انصاری جنگ بلقان میں ترکوں کی طبی مدد کے لیے ہندوستانی وفد کے سربراہ مقرر ہوئے اور ایک وفد لے کر قسطنطنیہ کے لیے روانہ ہوئے۔ لکھنؤ میں ڈاکٹر مختار انصاری کی روانگی کا منظر مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں:

مولانا محمد علی مرحوم کی کوشش سے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی سرکردگی میں اس لڑائی میں ایک طبی وفد نومبر ۱۹۱۲ء میں ترکی کے محاذِ جنگ پر بھیجا گیا تھا۔ اس کے ممبر شعیب قریشی (موجودہ وزیر حضور بھوپال)، چودھری خلیق الزماں وکیل لکھنو، عبدالرحمن صاحب صدیقی (موجودہ ممبر اسمبلی بنگال) اور عبدالعزیز انصاری وغیرہ تھے۔ یہ سب اس زمانہ میں علی گڑھ کالج میں زیرِ تعلیم تھے مگر جوش کا یہ عالم تھا کہ تعلیم چھوڑ کر زخمی مسلمانوں کی مرہم پٹی کے لیے چل کھڑے ہوئے۔ ڈاکٹر سید عبدالرحمن صاحب (موجودہ میڈیکل افسر بھوپال) جو اس وقت انگلینڈ میں اپنی طبی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے وہیں سے سیدھے چل کر قسطنطنیہ پہنچے۔ ڈاکٹر نعیم انصاری بھی وفد کے ہمراہ تھے اور وہ بھی انگلینڈ ہی سے آکر ملے تھے۔ اس وفد کے تمام اخراجات ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے چندوں سے پورے کیے اور تاریخ میں یہ ترک بھائیوں کی خدمت کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کا اپنی قسم کا پہلا کارنامہ تھا۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم جو برسوں لندن کے شفاخانوں میں کام کر چکے تھے اس وقت ہندوستان میں موجود تھے۔ موصوف کا وطن غازی پور میں یوسف پور کا قصبہ ہے، اعظم گڑھ سے جو مولانا کا وطن تھا نسبۃً قریب ہے اور ڈاکٹر صاحب موصوف کے بڑے بھائی حکیم عبدالوہاب مشہور حکیم نابینا صاحب مولانا کے ہم درس تھے۔ انہوں نے بھی اعظم گڑھ میں (مدرسہ عربیہ) مولانا فاروق صاحب سے پڑھا تھا۔ مولانا اور ڈاکٹر صاحب کی عمروں میں بڑا تفاوت تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت بالکل جوان تھے اور مولانا بوڑھے۔ اس پر بھی یہ منظر آنکھوں نے دیکھا کہ ڈاکٹر انصاری صاحب لکھنؤ ہو کر روانگی کے لیے دہلی جا رہے ہیں۔ لکھنؤ کے اور چند ممتاز لوگ بھی الوداع کہنے کو موجود ہیں۔ گاڑی روانہ ہونے کو ہے، مولانا پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں، ڈاکٹر صاحب ڈبہ کے دروازے پر کھڑے الوداعی سلام کر رہے ہیں کہ دفعتاً اس ہمہ تن جوش علامۂ وقت کا وہ سر جو بڑے بڑے جباروں کے سامنے بھی نہیں جھکا تھا، دفعتاً ڈاکٹر انصاری کے بوٹ پر جھک گیا، آنسوؤں نے اس کے گرد و غبار کو دھویا اور لب نے اس کے بوسے لیے اور گاڑی اسلامی

غیرت و حمیت کے ان گہر ہائے گراں مایہ کو لے کر آگے بڑھی۔[۱]

اس واقعے سے علامہ شبلی کے ملی جذبات، حمیت و غیرت اسلامی اور ترکوں سے بے پناہ محبت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس واقعے سے پہلے وہ ترکی کا تعلیمی سفر کر چکے تھے اور تمغۂ مجیدیہ سے سرفراز بھی ہو چکے تھے۔ چند ماہ بعد نومبر میں جنگ کے خاتمے پر ڈاکٹر مختار انصاری کا طبی وفد ہندوستان واپس آیا۔ اتفاق سے علامہ شبلی اس وقت بمبئی ہی میں تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کا ذکر بھی "حیات شبلی" میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

جب وہ جہاز سے اترے تو مولانا (شبلی) نے ان کے پاؤں دوبارہ چومنے چاہے، ڈاکٹر صاحب نے معذرت چاہی، تو فرمایا کہ "یہ تمہارے پاؤں نہیں، اسلام کے مجسمہ غربت کے پاؤں ہیں"۔[۲]

ڈاکٹر انصاری کے طبی وفد کے استقبال میں بمبئی میں جلسہ ہوا۔ علامہ شبلی اس میں شریک ہوئے اور ان کے دل میں جو جذبات تھے وہ ایک نظم کی صورت میں ظاہر ہوئے اور کلیات شبلی میں "خیر مقدم ڈاکٹر انصاری" کے عنوان سے شامل ہیں۔ یہ لاجواب نظم آج بھی دلوں میں جوش وجذبہ اور ولولہ انگیز کیفیت پیدا کر دیتی ہے اور غیرتِ ایمانی جاگ جاتی ہے۔ طوالت کے باوجود تاریخی حیثیت کی بنا پر یہاں پوری نظم نقل کی جاتی ہے:

ادا کرتے ہیں ہم شکر جناب حضرت باری
کہ آئے خیریت سے ممبران وفد انصاری
ہزاروں کوس جاکر بھائیوں کی تم نے خدمت کی
یہی تھا درد اسلامی، یہی تھی رسم غم خواری
فراق ملک و ترک خانماں و دوری منزل
خدا کے فضل سے تم نے یہ کڑیاں جھیل لیں ساری
تمہارے روکنے کے واسطے ہنگامہ آرا تھے
صدائے نالہ ہائے درد و جوش گریہ و زاری

---

[۱] سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۵، ص: ۵۵۷-۵۵۸
[۲] حیات شبلی، ص ۵۵۸

نگاہ حسرت آلود عزیزاں کی سنا باری
فغان سینہ ریشان، محبت کی شرر باری
مگر اِک جذبۂ اسلام نے سب کو شکستیں دیں
کہ سب کو چھوڑ کر پہنچے وہاں با ایں گراں باری
جو سچ پوچھو تو تم انصار بھی ہو اور مہاجر بھی
کہ سب اہل وطن کو چھوڑ کر پہنچے پئے یاری
کسی کو خواب میں بھی یہ سعادت مل نہیں سکتی
مریضوں کے لیے وہ آپ کی شب ہائے بیداری
جو سچ پوچھو تو زیبا ہے تمہیں دعوائے آقائی
کہ تم نے کی ہے ترکمان مجاہد کی پرستاری
تمہارا ناز اٹھائیں اہل ملت جس قدر کم ہے
کہ تم نے غازیان دیں کی کی ہے نازبرداری
تمہارے سامنے موتی کی لڑیاں پوت سے کم ہیں
کہ دیکھ آئے ہو تم ترکی یتیموں کی گہر باری
تمہیں کچھ جاں نوازی ہائے اسلامی کو سمجھو گے
نہیں ہے سوز اسلامی کا گو نام و نشاں باقی
کہ تم دیکھ آئے ہو نصرانیوں کا طرز خوں خواری
تمہارے دل میں ہیں کچھ درد کی چنگاریاں باقی
مسلمانوں کے تم نے طالع واژوں بھی دیکھے ہیں
نئے سب انقلابِ گردشِ گردوں بھی دیکھے ہیں
تمہارا دردِ دل سمجھیں گے کیا ہندوستاں والے
کہ تم نے وہ مظالم ہائے روز افزوں بھی دیکھے ہیں
یتیموں کے سنے ہیں نالہ ہائے جاں گزا تم نے

زنانِ بےنوا کے چہرۂ محزوں بھی دیکھے ہیں
گھروں کو لُوٹنے کے بعد زندوں کو جلا دینا
بلادِ مغربی کے یہ نئے قانوں بھی دیکھے ہیں
مسلمانوں کا قتل عام اور ترکوں کی بربادی
نتائج ہائے امید گلیڈسٹوں بھی دیکھے ہیں
تمہیں نے غازیوں کے زخم پر ٹانکے لگائے ہیں
شہیدانِ وطن کے جامۂ پُرخوں بھی دیکھے ہیں
تمہاری چشم عبرت گیر خود ہم سے یہ کہتی ہے
کہ ہم نے وہ مصائب ہائے گوناگوں بھی دیکھے ہیں
لہو کی چادریں دیکھی ہیں رخسار شہیداں پر
زمیں پر پارہ ہائے سینۂ پُرخوں بھی دیکھے ہیں
نگار آرائیاں دیکھی ہیں چشم گوہر افشاں کی
شہیدانِ وفا کے عارضِ گُل گوں بھی دیکھے ہیں
تمہیں سے کچھ پتہ چلتا ہے، شیدایان ملت کا
کہ تم نے شاہد اسلام کے مفتوں بھی دیکھے ہیں
جنون جوش اسلامی کوئی سمجھا تو تم سمجھے
کہ تم نے لیلیٰ اسلام کے مجنوں بھی دیکھے ہیں
سہارا ہے اگر امید کا اب بھی کوئی باقی
تو تم نے وہ رموز قوت مکنوں بھی دیکھے ہیں
عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں
دعائے کہنہ سالاں ہے اگر مقبول یزدانی

تو اب دست دعا ہے اور یہ شبلی نعمانی[۳]

جیسا کہ اوپر آچکا ہے کہ یہ خیر مقدم اولاً ڈاکٹر مختار انصاری کے خیر مقدمی جلسے میں جو بمبئی میں منعقد ہوا تھا، پڑھا گیا۔ مولانا حمید الدین فراہی کے نام علامہ شبلی ایک خط میں لکھتے ہیں:

انصاری وفد جو قسطنطنیہ سے واپس آیا اس پر میں نے ایک نظم لکھی تھی، شاید تم نے دیکھی ہو، زمیندار (لاہور) اور وکیل (امرتسر) میں چھپی تھی، جلسے میں تمام لوگ روتے تھے، مجھ پر خود بھی رقت تھی۔[۴]

بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ علامہ شبلی کا یہ "خیر مقدم ڈاکٹر مختار احمد انصاری" انگریزی حکومت کو سخت گراں گذرا اور اس نے اس کو ضبط کر لیا، اس کے ضبط کرنے کا ذکر کلیات شبلی اردو میں نہیں ہے، لیکن مجموعہ نظم کے ضبط کرنے کا شہرہ دور دور تک پھیلا، چنانچہ دیسنہ بہار سے علامہ شبلی کے ایک بڑے قدرداں مولوی سید عبدالحکیم دسنوی مرحوم نے ان سے دریافت حال کیا تو اس کے جواب میں علامہ شبلی نے لکھا:

میری نظمیں ضبط نہیں ہوئی ہیں، بلکہ اور لوگوں کی نظموں کا ایک پمفلٹ کلکتہ سے شائع ہوا تھا، اس میں میری صرف ایک نظم تھی، سید سلیمان اس سے بخوبی واقف ہیں، ان سے دریافت فرما لیجئے۔[۵]

مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں علامہ شبلی نے لکھا:

میری نظموں کی ضبطی کا یہاں بہت برا اثر پڑا۔ لفٹنٹ گورنر صاحب سے ایک پارٹی میں سامنا ہو گیا۔ پہلے تو کہا "مزاج مقدس" پھر شکایت آمیز بلکہ طعن آمیز فقرے کہے۔ ابھی تک میں ان سے مل نہ سکا، جاسوسوں نے ان کو سب نظمیں پہنچائیں اور معنی سمجھائے۔ چیف سکریٹری صاحب بھی مجھ سے شاکی تھے۔ میں نے کہا کہ یہ اتفاقیہ خلاف معمول بات ہوئی، ورنہ میں نے تو ہمیشہ بے تعصبی پھیلانے کی کوشش کی ہے۔[۶]

---

[۳] سید سلیمان ندوی، کلیات شبلی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۷، ص: ۱۲۲- ۱۲۵

[۴] سید سلیمان ندوی، مکاتیب شبلی، حصہ دوم، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۲، ص: ۳۸

[۵] سید سلیمان ندوی، مکاتیب شبلی، اول، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۰، ص: ۲۹۳

[۶] مکاتیب شبلی، دوم، ص: ۹۲

اسی زمانہ میں نظم کی ضبطی کے واقعے کا ذکر تو بہت ہوا مگر اصلاً کون سی نظم ضبط ہوئی، اس کے ذکر سے خود علامہ شبلی نے بھی احتراز کیا اور دوسروں نے بھی اس کے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔

انگریزوں نے جو نظمیں، غزلیں، افسانے یا ان کے مجموعے ضبط کیے تھے یا جن پر پابندی عائد کی تھی ان کو انڈیا آفس لائبریری لندن منتقل کرا دیا تھا، اس لیے ان سے عام واقفیت نہ ہو سکی، باوجود اس کے اہل علم و صاحب قلم نے آزادی کے بعد ان کو حاصل کر کے ان کا انتخاب کتابی صورت میں شائع کیا۔ ۱۹۹۳ء میں ڈاکٹر راجیش کمار پرتی نے ضبط شدہ ادب کو انڈیا آفس لندن سے حاصل کرنے کی کوشش کی اور جو کچھ ملا اسے نیشنل آرکائیوز نئی دہلی میں محفوظ کرا دیا۔ خود انہوں نے ضبط شدہ نظموں کا ایک انتخاب "آشوب" جلد اول کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ علامہ شبلی نے ڈاکٹر انصاری کے قسطنطنیہ سے واپسی پر جو خیر مقدم لکھا تھا وہ حکومت کی نظر میں قابل ضبطی قرار دیا پایا تھا۔ اس خیر مقدم کی مولانا محمد علی جوہر کے اخبار ہمدرد میں تاریخ اشاعت ۱۲/ جولائی ۱۹۱۳ء درج ہے، جبکہ نیشنل آرکائیوز میں اس کا اندراج نمبر ۴۸۱۰ ہے۔[۷]

خیر مقدم ڈاکٹر انصاری مولانا محمد علی جوہر کے اخبار ہمدرد دہلی میں شائع ہونے کے بعد اس مجموعہ یا بقول شبلی پمفلٹ میں نقل ہوا جو کلکتہ سے شائع ہوا اور جسے ضبط کیا گیا تھا، وہ پمفلٹ راقم کو دستیاب نہیں ہو سکا بلکہ اس کا نام بھی سرے سے اب تک معلوم نہیں ہے۔

اس نظم کی ضبطی کی کارروائی میں کیا سبب ضبطی بنا اور اس کے بعد کیا کارروائی ہوئی، اس کی تفصیلات بھی دستیاب نہیں ہیں۔ البتہ یہ خیر مقدمی نظم کلیات شبلی اردو میں شامل ہے، جسے دارالمصنّفین نے آزادی سے پہلے شائع کیا تھا، غالباً اسی وجہ سے "کلیات شبلی" اردو میں اس کی ضبطی کا ذکر نہیں کیا گیا ہے کہ کہیں دوبارہ نہ کوئی قصہ ہو جائے۔

اس کے علاوہ بھی علامہ شبلی کی چند نظمیں ایسی ہیں جنہیں بعد میں انگریزی حکومت نے ضبط

---

[۷] ڈاکٹر راجیش کمار پرتی، آشوب، جلد اول، نیشنل آرکائیوز آف انڈیا نئی دہلی، اگست ۱۹۹۳، ص: ۱۰- ۱۱۔

کیا، مثلاً ایک مجموعہ "آزادی کی نظمیں" مرتبہ سبط حسن میں علامہ شبلی کی درج ذیل نظمیں یا اس کے چند بند شامل ہیں:

احرار قوم اور طفل سیاست

(۱)

یہ اعتراض آپ کا بے شک صحیح ہے
احرار قوم میں ہیں بہت خامیاں ابھی
چلتے ہیں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
گم گشتہ طریق ہے یہ کارواں ابھی
زود اعتقادیاں ہیں، تلون ہے، وہم ہے
ہو جاتے ہیں ہر اک سے یہ بدگماں ابھی
دل میں ہے عزم اور نہ ارادوں میں ہے ثبات
بے اعتدالیاں ہیں ادائے کلام میں
باہر ہے اختیار سے ان کے زباں ابھی
ہر دم ہیں گو مسائل ملکی زبان پر
ان میں سے ایک بھی تو نہیں نکتہ داں ابھی
یہ سب بجا درست، مگر سچ جو پوچھئے
جو کچھ کہ ہے، یہ ہے اثر رفتگاں ابھی
یہ ہے اسی سیاست پارینہ کا اثر
گو شمع بجھ چکی ہے مگر ہے دھواں ابھی
موزوں نہیں ہے جنبش اعضا تو کیا عجب
شب کے خمار کی یہ ہیں انگڑائیاں ابھی
چلتے ہیں لڑکھڑاتے ہیں اک اک قدم پہ پاؤں
چھوٹے ہیں قید سخت سے یہ خستہ جاں ابھی

بیکار کر دیے تھے جو خود بازوئے عمل
گو کھینچتے ہیں پر نہیں کھنچتی کماں ابھی
آئے کہاں سے قوت رفتار پاؤں میں
کچھ بیڑیاں ہیں پاؤں کی بند گراں ابھی
غوغا ہے، کچھ مباحث ملی نہیں ہیں یہ
اک طفل ہے، سیاست ہندوستاں ابھی[۸]

(۲)

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو!
یہ ظلم آرائیاں تاکے ، یہ حشر انگیزیاں کب تک
یہ جوش انگیزیٔ طوفانِ بیداد و بلا تاکے؟
یہ لطف انگیزیٔ ہنگامۂ آہ وفغاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہو گا اس کا امتحاں کب تک
نگارستان خوں کی سیر گر تم نے نہیں دیکھی
تو ہم دکھلائیں تم کو زخمہائے خوں چکاں کب تک
یہ مانا گرمیٔ محفل کے ساماں چاہئیں تم کو
دکھائیں ہم تمہیں ہنگامہ آہ و فغاں کب تک
یہ مانا قصہ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے
سنائیں تم کو اپنے درد دل کی داستاں کب تک
یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کب تک

(۸) سبط حسن، آزادی کی نظمیں، اترپردیش اردو اکادمی لکھنو، طبع اول ۱۹۸۵، ص: ۳۲ - ۳۳۔

عروس بخت کی خاطر تمہیں درکار ہے افشاں
ہمارے ذرہ ہائے خاک ہوں گے زرفشاں کب تک[۹]

(۳)

تم کسی قوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھو
دو ہی باتیں ہیں کہ جن پر ہے ترقی کا مدار
یا کوئی جذبۂ دینی تھا کہ جس نے دم میں
کر دیا ذرۂ افسردہ کو ہم رنگ شرار
یا کوئی جاذبۂ ملک و وطن تھا جس نے
کر دئے دم میں قوائے عملی سب بیدار
ہے اسی مئے سے یہ سرمستی احرار وطن
ہے اسی نشہ سے یہ گرمی ہنگامہ کار
مدتوں بحث سیاست کی اجازت ہی نہ تھی
کہ وفاداری مسلم کا تھا یہ خاص شعار
اب اجازت ہے مگر دائرۂ بحث ہے یہ
کہ گورنمنٹ سے اس بات کے ہوں عرض گذار
ہم کو پامال کیے دیتے ہیں ابنائے وطن
ڈر ہے پس جائے نہ یہ فرقہ اخلاص شعار
یہ بھی اک گونہ شکایت ہے غلاموں کو ضرور
کہ مناصب میں ہے کم حلقہ بگوشوں کا شمار[۱۰]

---

[۹] آزادی کی نظمیں، ص:۳۳ - ۳۴۔
[۱۰] آزادی کی نظمیں، ص:۳۴

یہ نامکمل نظمیں مجموعہ "آزادی کی نظمیں" میں شامل ہیں جو انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس رام گڑھ کے موقع پر بعجلت تمام مرتب کیا گیا تھا۔ دوسری عالمی جنگ (۱۹۳۹-۱۹۴۴ء) کے آغاز میں یہ کتاب شائع ہوئی اور انگریزی حکومت کی نظر میں اس قدر خطرناک ٹھہری کہ اسی ماہ میں صوبے کی سرکار نے ضبط کر لیا۔[۱۱]

دوسری نظم جو علامہ شبلی کا بہت مشہور "شہر آشوب اسلام" کا ایک بند ہے اور کلیات شبلی اردو میں شامل ہے اسے "آزادی کے ترانے" کے مرتب ڈاکٹر راجیش کمار پرتی نے بھی اپنے مجموعے میں شامل کیا ہے۔

علامہ شبلی کی سیاسی نظمیں جو الہلال، ہمدرد، مسلم گزٹ اور زمیندار لاہور وغیرہ میں شائع ہوئی ہیں ان سے جدوجہد آزادی کی راہیں یقیناً ہموار ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے عہد میں جب یہ چھپیں تو ہر طرف ان کا غلغلہ بلند ہوا۔ انگریزی حکومت ان سے ناواقف نہ تھی، پھر بھی خاموش رہی۔ مگر جب اس کے بعد بھی علامہ شبلی کی باغیانہ نظموں کا سلسلہ بند نہیں ہوا تو ان کے خلاف کارروائی طے ہوئی۔ سی آئی ڈی پیچھے لگا دی گئی، نومبر ۱۹۱۴ء میں قبل اس کے کہ انہیں گرفتار کیا جاتا یا اور کوئی کارروائی ہوتی علامہ شبلی نعمانی اس دنیا کی قید وبند سے آزاد ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بہر کیف جنگ آزادی میں ان کی نظموں کا بڑا اہم حصہ ہے۔

علامہ شبلی کی سیاسی اور اسلامی حمیت سے لبریز نظمیں اور مضامین جن اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے تھے، ان کے مدیر علامہ شبلی کے لائق اور نامور تلامذہ اور منتسبین تھے، جن کے سیاسی ذوق کی آبیاری میں بھی علامہ شبلی کا بڑا نمایاں حصہ تھا، مثلاً ہمدرد دہلی کے مدیر مولانا محمد علی جوہر، زمیندار لاہور کے مدیر مولانا ظفر علی خاں، مسلم گزٹ لکھنؤ کے مدیر وحید الدین سلیم، الہلال کلکتہ کے مدیر مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ۔ اردو کے یہ وہ اخبارات ورسائل ہیں جنہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی بیداری میں اہم کردار ادا کیا اور ان میں جنگ آزادی کی روح پھونکی۔

---

[۱۱] پیش لفظ، آزادی کی نظمیں

الطاف حسین حالؔی کی کتاب ''اصولِ فارسی''

ڈاکٹر مہتاب جہاں
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی
mehtabjahan6@gmail.com

''اصول فارسی''مولانا الطاف حسین حالؔی کی ایک اہم تصنیف ہے۔ فارسی کے اصول و قواعد یعنی فارسی گرامر پر لکھی گئی یہ کتاب اردو زبان میں ہے۔ اس میں فارسی کی صرف و نحو پر بحث کی گئی ہے۔ اکثر گرامر کی کتابوں میں صرف و نحو کو ایک ہی باب میں شامل کر دیا جاتا تھا جو مختلف زبانوں کے قواعد پر مبنی ہوتی ہیں، مگر اس کتاب میں ایسا نہیں کیا گیا ہے۔ مولانا حالؔی نے صرف و نحو کو دو الگ الگ ابواب میں منقسم کیا ہے۔

مولانا الطاف حسین حالؔی نے جس جانفشانی اور محنت و لگن سے اس کتاب کو مرتب کیا اور اپنے ذولسانی علم کو بروئے کار لائے وہ بے حد قابل تعریف ہے۔ لیکن مولانا حالؔی کے اس کام کو جس قدر پذیرائی ملنی چاہیے تھی وہ ان کی زندگی میں نصیب نہیں ہوئی۔ انہوں نے یہ کتاب انیسویں صدی کے وسط میں انگریزوں کی ایماء پر تحریر کی، انگریزوں نے ہندوستان میں لکھی جانے والی اور بولی جانے والی زبانوں کے اصول و قواعد منظم انداز میں اسکولوں میں پڑھانے کے لیے ہر زبان کے جاننے والوں کو دعوت دی تھی کہ وہ متعلقہ زبان کے قواعد مرتب کریں۔ جو کتابیں حکومت کے لیے قابل قبول ہوں گی ان پر انعام دیا جائے گا اور ان کتابوں کو اسکولوں کے نصاب میں شامل کیا جائے گا۔ مولانا حالؔی اس کے بارے میں اپنی کتاب ''اصول فارسی''میں تحریر کرتے ہیں کہ ''ہماری گورنمنٹ ہمات عالی اس بات میں بہت مصروف ہے کہ جو زبانیں ہندوستان میں رائج ہیں یا جن زبانوں کی کتابیں ہندوستان کی درس و تدریس میں مستعمل ہیں، ان کی اصلاح بخوبی کی جائے اور ان کے اصول و قواعد اس طور پر لکھے جائیں کہ ہر مبتدی بہ ادنیٰ توجہ ان قاعدوں کے ذریعے سے ان زبانوں میں تقریر اور تحریر کا سلیقہ پیدا کر سکے۔ اور ایک اشتہار جو گورنمنٹ پنجاب دام اقبال نے ۱۸۶۸ء بہ وعدۂ انعام جاری فرمایا ہے اس کا عمدہ مطلب یہ ہے کہ زبان فارسی کے اصول اردو زبان

میں بہ عبارت روشن واضح کیے جائیں"۔ مگر یہ کتاب آسان فہم ہونے کے بجائے ثقیل فارسی میں لکھی گئی ہے۔ یہاں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ شاید اُس زمانے کا طرزِ نگارش ایسا ہی رہا ہو گا یا مولانا کی نظر میں کتاب کی زبان عام فہم تھی۔

اصول فارسی کے دو قلمی نسخوں کے بارے میں اطلاعات ملتی ہیں۔ ایک قلمی نسخہ وہ ہے جس کا ذکر محمد اسماعیل پانی پتی نے اپنے مضمون نقوش جملہ (نقوش لاہور شمارہ' ۳۵-۳۶ 'اکتوبر، نومبر ۱۹۵۳ء) میں کیا تھا کہ انہوں نے ۱۹۱۸ء میں حضرت خواجہ سجاد حسین (مولانا کے فرزند) کی لائبریری میں دیکھا تھا اور اس کے مشمولات وہاں سے نقل کئے تھے۔ دوسرا نسخہ پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہے اور گمان یہ ہوتا ہے کہ یہ وہی نسخہ ہے جو انعامی مقابلے میں شامل ہونے کی غرض سے حکومت پنجاب کے محکمۂ تعلیم میں جمع کرایا گیا تھا۔ دونوں قلمی نسخوں کا طرزِ املا اور ترتیب بالکل یکساں ہے، صفحات کی تعداد اور اس کے سائز میں البتہ فرق ہے۔ مثلاً اسمٰعیل پانی پتی والے قلمی نسخے کے کاغذ کا سائز فُل اسکیپ ہے۔ اور مخطوطے کے صفحات کی تعداد ۲۵۹ ہے جبکہ پنجاب یونیورسٹی والے قلمی نسخے کا سائز چھوٹا ہے اور اس کے کل صفحات کی تعداد ۳۸۱ ہیں اور ہر صفحہ کی سطروں کی تعداد دونوں نسخوں میں ۱۵ ہے، اور فی سطر الفاظ کی تعداد لگ بھگ برابر ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کا نسخہ بالکل صاف ستھرا ہے۔ اور کہیں کہیں اس کے حاشیے پر ایسے الفاظ اور عبارات تحریر ہیں جو متن میں شاید لکھنے سے رہ گئی تھیں۔

دوسرا نسخہ وہ ہے جس کو ۱۹۷۰ء میں مرحوم پروفیسر حمید احمد خان نے بحیثیت ناظم مجلس ترقی ادب لاہور یونیورسٹی کی لائبریری سے اس قلمی نسخے کی ایک فوٹو کاپی حاصل کی اور اس کی ایک نقل تیار کرائی۔ مجلس ترقی ادب لاہور نے یونیورسٹی کے جس مخطوطے کی فوٹو گرافک نقل حاصل کی تھی اس کی زمین سیاہ ہے اور الفاظ سفید۔ یہ نقل مجلس ترقی ادب کی لائبریری میں محفوظ ہے۔

۱۹۷۰ء سے لے کے ۲۰۰۶ء تک مجلس ترقی ادب لاہور کے تین ناظم مقرر ہوئے۔ حمید احمد خان اور دوسرے احمد ندیم قاسمی کے دور میں اس کی اشاعت نہیں ہو سکی۔ آخر کار شہزاد احمد نے اس کتاب کی ترتیب و تدوین کا کام احمد رضا کو سونپ دیا۔ احمد رضا نے تین سالوں کی کاوش سے اس کتاب کو ۲۰۰۹ء میں اشاعت کی منزل تک پہنچایا اور بالآخر یہ کتاب قارئین تک پہنچ گئی۔ احمد رضا کی یہ مرتبہ کتاب اب کتابخانوں میں دستیاب ہے اور ریختہ کی ویب سائٹ پر بھی موجود ہے۔

اصول فارسی کے مرتب احمد رضا اس کتاب کی ترتیب و تدوین کے دوران پیش آئی مشکلات

ودشواریوں کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں:

اس کتاب کی ترتیب کا کام اس لحاظ سے نہایت مشکل تھا کہ اگرچہ مولانا نے اس کتاب کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے مختلف ابواب میں اس کو بانٹ دیا تھا۔ جو یقیناً ایک نئی بات تھی۔ اور اس ترتیبِ کتب کا ایک نیا رجحان سامنے آیا ہے۔ اس کتاب کے متن میں تو حصص وابواب کی تخصیص کی گئی ہے لیکن ان حصوں اور ابواب کو کہیں بھی نئے صفحات سے شروع نہیں کیا گیا۔ ایک مسلسل عبارت ہے جس کے اندر حصے بھی آگئے ہیں اور ابواب بھی۔ ان میں سے کسی کو بھی نئے صفحے سے شروع نہیں کیا گیا۔ متن میں سینکڑوں اشعار اور فارسی عبارت کو بطورِ نظیر پیش کیا گیا ہے، مگر نہ تو عبارتوں کو بیان کیا گیا اور نہ ہی اشعار اور مصرعوں کو الگ سطور میں جگہ دی گئی ہے۔ لہٰذا اشعار کو نثر سے الگ کرنا ایک جان جوکھوں کا کام تھا۔

"اصول فارسی" سے متعلق ایک مضمون مجلہ "نقوش" میں ۱۹۵۳ء کے شمارے ۳۵-۳۶، اکتوبر و نومبر میں اسمٰعیل پانی پتی نے تحریر کیا تھا۔ وہ بھی اس کتاب کے بارے میں اہم اطلاعات کے ساتھ ساتھ اس کتاب کی زبان اور طرزِ ادا پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہوں نے یہ کتاب ان کے بیٹے حضرت خواجہ سجاد حسین صاحب کی لائبریری میں ۱۹۱۸ء میں دیکھی تھی اور وہاں سے اس قلمی نسخے کے دیباچے اور عنوانات و مندرجاتِ کتاب کی فہرست نقل کی تھی۔

آگے وہ لکھتے ہیں:

یہ کتاب تمام تر حضرت مولانا حالی کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی ہے۔ تحریر بہت خوش خط اور صاف ہے۔ بین السطور کھلا کھلا ہے..... اور کتاب میں کہیں کوئی داغ دھبہ نہیں۔ البتہ کاغذ پیلا ہو گیا ہے۔ اور کتاب کو مع جلد کے کیڑے نے جگہ جگہ سے کھالیا ہے۔ جلد بہت بوسیدہ ہے۔ کتاب کی تمہید ۹ صفحات میں آئی ہے۔ اس کے بعد علم صرف کا حصہ ۱۲۴ صفحات میں مولانا حالی نے تحریر کیا ہے۔ اس کے بعد "علم نحو" کا بیان ۱۲۶ صفحات میں ہے۔ یعنی کل صفحات کی تعداد مع کتاب کی تمہید ۲۵۹ ہے۔ تمام کتاب کالی سیاہی اور نیزے کے قلم سے لکھی ہوئی ہے۔

اسمٰعیل پانی پتی کہتے ہیں:

۱۔ ہر جگہ بجائے چونکہ "جو کہ" لکھا ہے۔

۲۔ ساری کتاب میں ڈیش نہیں ہے اور نہ الگ الگ پیرے ہیں بلکہ مضمون مسلسل چلا گیا ہے۔ جہاں مولانا کو نیا فقرہ شروع کرنا ہو وہاں علامت... بنا دیتے ہیں۔ مگر یہ علامت کتابِ مذکور میں اکثر جگہ بغیر نئے فقرے کے بعض الفاظ پر بھی لکھی ہوئی ہے۔ ان کی، اس کی، ان، اس وغیرہ

الفاظ کو بالعموم اس طرح لکھا ہے:

۳۔ اُونکی، اُوسکی، اُوس، اُون وغیرہ (یہ طرزِ نگارش اُس وقت رائج تھا)

۴۔ تمام کتاب میں نون غنہ کا استعمال نہیں کیا گیا ہے، بلکہ ہر جگہ پورا نون لکھا ہے۔ "زبانین" وغیرہ یعنی نون میں نقطہ ضرور دیا ہے۔

۵۔ جہاں جہاں کتاب میں "ٹ" آئی ہے اس کو ہمیشہ "ت" لکھا ہے۔

۶۔ یائے مجہول کو بالعموم یائے معروف لکھا ہے۔ مثلاً جتنے کو "جتنی" تحریر کیا ہے۔

۷۔ حرف "گ" کو ساری کتاب میں "ک" لکھا ہے، مثلاً "اگر" کو "اکر" گورنمنٹ کو "کورنمنٹ" لکھا ہے۔

۸۔ پیچھے لکھی وغیرہ الفاظ کو "پیچھے لکھی" وغیرہ لکھا ہے۔ ایک جگہ پارسی کہلانے لگی کے بجائے پارسی کھلانے لگی، لکھا ہے۔

۹۔ ساری کتاب میں کہیں علامتِ اضافت یعنی زیر نظر نہیں آیا۔

اسمٰعیل پانی پتی مولانا کی کتاب "اصول فارسی" کے بارے میں مزید کہتے ہیں کہ "آج سے ۳۵ برس پہلے ۱۸۶۸ء میں اصول فارسی کے نام سے فارسی صرف و نحو کے متعلق ایک بسیط اور مفصل کتاب اردو میں لکھی گئی تھی جو نہ مولانا کی زندگی میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو سکی اور نہ مولانا کی وفات کے بعد۔ مولانا کے فرزند خواجہ سجاد حسین نے اس کی طباعت کا خیال کیا لیکن وہ ان کے ذاتی کتب خانے میں ان کے والد کی دوسری نایاب کتابوں کے ساتھ محفوظ رہی۔ ۱۹۴۶ء میں ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ چونکہ حضرت خواجہ صاحب مرحوم (خواجہ سجاد حسین) کے کوئی لڑکا نہیں تھا، اس لیے مکان بند پڑا رہا۔ اور یہ علمی تبرکات الماریوں میں مقفل رہے۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں پتا نہیں کہ مکانِ مذکور لُٹ گیا یا محفوظ رہا۔ اور ان تبرکات کا کیا حشر ہوا اور یہ نایاب کتاب اس وقت کہاں ہے اور کس کے پاس ہے"۔

اس کتاب کی اہمیت و افادیت کو جاننے کے لئے اس کے مندرجات یا عنوانات کو دیکھنا بہت ضروری ہے۔ اس کے مشمولات یا فہرست عناوین یہ ہیں:

۱۔ پہلا حصہ: "علمِ صَرفِ فارسی کے بیان میں": اس میں مقدمے کے عنوان سے علمِ صرف کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ اس کے کئی باب ہیں۔ پہلے باب کا عنوان ہے "حرفوں کے بیان میں" اس میں حروف تہجی سے متعلق مفصل بحث کی گئی ہے۔ ہر حرف کی تعریف مثالوں کے ساتھ بیان کی گئی

ہے اور ہر مثال فارسی کے ناموں کے ساتھ پیش کی گئی تھی۔

۲۔ دوسرا باب: "مصدر اور مشتق کے بیان میں": اس میں مصدر کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا گیا کہ مصدر کیا ہے کسے کہتے ہیں، اس کے حذف کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ اس کی پہچان کیا ہے۔ مصدر کی قسمیں لازم و معتدی کو مثالوں کے ذریعے سمجھایا گیا اور اردو ترجمہ جہاں بھی اس کی ضرورت محسوس ہوئی ہے، کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر عنوانات بھی زیر بحث ہیں جیسے حاصل مصدر کیسے مصدر اور مضارع سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ فارسی سیکھنے والے حضرات کے لیے بہت اہم ہے کیونکہ زیادہ تر نئے سیکھنے والا طالب علم اس کے بارے میں یہ تصور کرتا ہے کہ حاصل مصدر، مصدر کو ہی کہتے ہیں جیسے کردن، گفتن، رفتن، وغیرہ جبکہ حاصل مصدر وہ ہے جو حروفوں کے جوڑ سے مصدر سے نئے بامعنی لفظ بنتے ہیں جیسے رفتن سے رفتار، اس کے مضارع سے روش، کردن کے مصدر سے کردار، کارکن، وغیرہ۔

اس کے علاوہ اس باب میں تمام زمانوں کے بارے میں بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، مثلاً ماضی، ماضی مطلق، ماضی قریب، ماضی بعید، ماضی احتمالی، ماضی استمراری، ماضی تمنائی کو جدا جدا تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ ایک ایک لفظ کی تشریح و معنی دیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ زمانہ آئندہ پر بھی مفصل بحث کتاب میں موجود ہے، جیسے مستقبل، مضارع، فعل امر، اس کے تمام قاعدے جیسے فعل امر، امر مستعمر، امر نہی، مگر زیادہ تفصیل اور طوالت کے باعث عبارت یہاں زیادہ بوجھل ہو گئی ہے۔ اگر کم لفظوں میں بات ختم کر دی جاتی تو بہتر ہوتا۔

آگے اسی باب میں اسم فاعل سے متعلق بیان امر میں اسم فاعل آیا ہے یعنی جس سے کوئی فعل واقع ہے۔ جیسے روندہ، آئندہ، گوینده، آرندہ، داننده، دارندہ، جوینده، زندہ وغیرہ۔ اسی باب میں اسم فاعل کے بعد اسم مفعول کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، جیسے اسم مفعول وہ ہے جس پر فاعل کا فعل واقع ہوا ہو۔ مثلاً کردہ سے کردہ اور آوردہ شد سے آوردہ شدہ وغیرہ۔ اس کے بعد صفت مشبّہ پر مصنف نے مفصل بحث کی ہے، مثال نادان، ناشناس، ناشکیب۔

اس کے علاوہ اسی باب میں ظرف، آلہ اور تنبیہ پر بھی مفصل بحث کی گئی ہے۔ نیز اردو ترجمے کے ساتھ بحث نفی فعل، حال مجہول، بحث امر معروف، بحث امر مجہول، بحث نہی مجہول: بحث اسم فاعل، اور بحث اسم مفعول گردانوں کی شکل میں نقشے دیے ہوئے ہیں۔ اسی کے ساتھ اہم مصادر کی ایک طویل فہرست دی ہوئی ہے، جو بہت کارآمد ہے۔

تیسرے باب میں "جامد" کے حوالے سے مفصل بحث کی گئی ہے۔ اور آخر میں جامد پر سوالات اور خاتمے میں علم صَرف پر سوالنامہ دیا گیا ہے۔ یہاں کتاب میں علم صرف تین ابواب میں مکمل ہوا ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ "علم نحو کے بیان میں" ہے۔ اس میں مقدمہ اس کے ساتھ مبتدا و خبر، فاعل، نائب فاعل، مفعول پر مفعول مطلق، مفعول فیہ، اسمائے اشارہ، اسم کنایہ، اسم تفصیل وغیرہ پر مفصل بحث کی گئی ہے۔

دوسرا باب " فعلوں کے بیان میں" ہے۔ اس باب میں لازم و متعدی، افعال ناقصہ، افعال مشبہ ظرف۔

تیسرے باب میں حرفوں سے متعلق مفصل بحث کی گئی ہے، مثلاً حروفِ بسیطہ کا بیان، حروف نفی، حروف زیادت، حروف تمنا وغیرہ۔

چوتھا باب "مرکب ناقص کے بیان میں" ہے۔ اس میں وصف ترکیبی، ترکیب عددی، تمیز پر تفصیل سے بات کی گئی ہے۔

پانچواں باب "مرکب تام کے بیان میں ہے جس میں ترکیبات پر بحث کی گئی ہے۔ آخر یا خاتمہ میں علم نحو پر سوالات درج ہیں۔

کتاب کا تیسرا حصہ "علم معانی کے بیان میں" ہے۔ اس میں مقدمہ کے ساتھ آٹھ باب ہیں اور ہر باب فارسی گرامر کے اہم موضوعات پر مشتمل ہے۔ اس میں بحث کی گئی ہے اسناد خبری، مسند الیہ، مسند، فعل، قصر، انشاء اور فصل و وصل پر۔ مساوات اور ایجاز و اطناب بھی آٹھویں باب میں شامل ہے۔ آخر میں علم معانی پر سوالات پوچھے گئے ہیں۔

چوتھا حصہ علم بیان کے بارے میں ہے اس میں مقدمہ کے ساتھ چار باب شامل ہیں جن میں مشبہ اور مشبہ بہ، وجہ تشبیہ، غرض تشبیہ، اقسام تشبیہ اور ادات تشبیہ ہے۔ دوسرے باب میں استعارہ سے متعلق تفصیل سے بحث کی گئی ہے، جس میں مستعار منہ، مستعار لہ اور وجہ جامع کا بیان ہے۔

تیسرا باب مجازِ مرسل کے بیان میں ہے۔ چوتھا باب کنایہ کے بارے میں ہے اور آخر میں سوالات دیے گئے ہیں۔

اس کتاب کا آخری اور پانچواں حصہ علم بدیع کے بیان کے بارے میں ہے۔ اس میں مقدمہ

کے ساتھ دو مفصل باب ہیں۔ پہلا باب صنائع معنوی کے بارے میں ہے جس میں تضاد، مراۃ النظیر، عکس، رجوع، توریہ استخدام، لف و نشر، جمع، تفریق، تقسیم، مبالغہ، حُسن تعلیل، استتباع، توجیہ، تجاہلِ عارف، تعجب اور اعتراض کو مثالوں کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔

دوسرا باب صنائع لفظی کے بارے میں ہے۔ اس میں مختلف صنعتوں کی تعریف مع مثال بیان کی گئی ہے، جیسے تجنیسِ تام، تجنیس ناقص، قلب، ردالعجز علی الصدر، غیر منقوط، رقطاء، صنعت خفیفہ، مقطع الحروف، موصل الحروف، ترصیع، ذوالقافیتین متلوّن، سیاق الاعداد، تنسیق صفات اور آخر میں دیگر ابواب اور حصوں کی مانند خاتمہ میں سوالات درج ہیں۔

اس کتاب کے مندرجات تحریر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اہل علم حضرات اس کتاب سے اگر رجوع نہیں کر پائے ہیں تو کم از کم اس کتاب کے عنوانات کو دیکھ کر رجوع کریں۔ یہ کتاب واقعی مولانا حالی کی ایک شاہکار کتاب ہے اور اردو کلاسیکی ادب میں اپنی ایک خاص جگہ رکھتی ہے۔ مگر ایک بات جو یہاں عرض کرنا لازم ہے وہ یہ کہ یہ کتاب اُس وقت کی ثقیل اردو میں لکھی گئی فارسی کی گرامر پر ایک مشکل کتاب ہے۔ اس کتاب کا دشوار ہونا اس سے بے اعتنائی کی ایک وجہ ہے۔ بہر حال "اصول فارسی" ایک اہم کتاب ہے جو مولانا حالی نے بڑی جانفشانی سے تحریر کی۔

مولانا حالی کی اہم تصانیف میں مسدسِ حالی، مقدمۂ شعر و شاعری اور یادگارِ غالب شامل ہیں۔ "مسدسِ حالی" حالی کی سب سے مشہور کتاب ہے جو مسلمانوں کی عظمت رفتہ اور زوال کا نوحہ ہے۔ یہ ایک قومی نظم تھی جس نے برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں میں انقلابی جذبات پیدا کیے۔ مولانا حالی نے اردو ادب کو نئے رجحانات اور موضوعات سے روشناس کرایا۔ انہوں نے شاعری اور نثر دونوں میں اصلاحات کی تحریک کو فروغ دیا اور مسلمانوں کی معاشرتی اور ادبی زندگی میں اہم تبدیلیاں لائیں۔ حالی نے اس بات پر زور دیا کہ شاعری کو زندگی کی عکاسی کرنی چاہیے اور اس میں ایسے موضوعات شامل ہونے چاہئیں جو معاشرتی اصلاح کے لیے مفید ہوں۔ مولانا حالی کی دیگر تصانیف بھی اپنے موضوعات کے اعتبار سے بہت اہم ہیں، خواہ وہ یادگار غالب ہو، یا حیاتِ سعدی، حیات جاوید یا مجالس النساء، یا مدوجزر اسلام ہوں۔ حالی نے صرف خشک مضامین پر ہی بحث نہیں کی ہے۔ ان کی تصانیف میں برکھارُت شامل ہے۔ اس میں انہوں نے برسات کی رونقوں اور خوبصورتیوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ چپ کی داد ان کا ایک شعری مجموعہ ہے جس میں انہوں نے خاموشی اور چُپ کی قدردانی کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔

شہادت مسجد کانپور ۱۹۱۳ء سے بلڈوزر کی سیاست تک

محمد علم اللہ، لندن
alamislahi@gmail.com

سنہ ۱۹۱۳ء میں کانپور مسجد کے ایک حصے کی شہادت کا واقعہ پیش آیا تھا۔ احتجاج کرنے والوں میں علامہ اقبالؒ کی شرکت کا ذکر ملتا ہے۔ ان کے علاوہ علامہ شبلیؒ[۱] اور دوسرے متعدد مشاہیر جیسے مولانا ظفر علی خان، مولانا آزاد سبحانی، محمد علی جوہر، مولانا فیض الحسن گنگوہی، مولانا عبد الباری فرنگی محلی، مولانا شوکت علی اور مولانا عبید اللہ سندھی وغیرہ[۲] نے اس سانحے پر شدید رنج وغم کا اظہار کیا تھا[۳]۔ یہ واقعہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ماضی میں مسلمانان ہند مساجد کے تقدس کی پامالی کو کس سنجیدگی سے لیتے تھے اور اس کے لیے کس حد تک جانے کو تیار رہتے تھے۔ اس وقت کے عمائدینِ ملّت، عوام کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہوتے تھے اور فرزندان ملت کے آنسو پونچھنے، ڈھارس بندھانے اور ان کی جدوجہد کی قیادت کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑتے تھے۔ اس وقت کے حالات اور ملی قائدین کے کردار کا موازنہ ہم موجودہ حالات اور موجودہ قیادت سے کرتے ہیں تو صورتحال میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔

اِس وقت مسلمانوں کے مکانوں، درگاہوں اور دیگر مذہبی وثقافتی اثاثوں پر حملے تو عام ہیں ہی، مساجد اور مدارس تک کو شہید کیا جانا اب معمول بن چکا ہے۔ آج جب کئی کئی سو سال پرانی مساجد، مدارس اور خانقاہوں کو بے دردی کے ساتھ شہید کیا جارہا ہے تو کوئی دادرس نظر نہیں آتا۔ مگر اُس وقت مسلمان مساجد کے تقدس کو بجا طور پر آخری لکیر تصور کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں کانپور

---

[۱] شبلی نعمانی، کلیاتِ شبلی اردو، کراچی: ادارۂ اشاعت، ص. ۸۵-۸۶

[۲] احمد، ف-ع (۲۰۲۰)۔ سانحہ مسجدِ کانپور: مسلم اردو صحافت کا ردِّ عمل اور شعری منظر نامہ- امتزاج: اردو ریسرچ جرنل، ۱۳(۱۳): https://imtezaaj.uok.edu.pk/website/journal/article/6111486ac4d52/page

[۳] ابو علی (اعظم گڈھ)، الہلال مؤرخہ ۱۳ر اگست ۱۹۱۳ء کا اداریہ مشہد اکبر نمبر ۱ اور مولانا سید سلیمان ندی، فاران، جلد ۱۲، شمارہ ۶، دفتر فاران کیمیکل اسٹریٹ، کراچی۔

میں ایک مسجد کے محض ایک حصے کے جزوی انہدام پر پورے ملت اسلامیہ ہند کی شدید بے چینی اور اس کے خلاف ان کا شدید احتجاج معاملے کی انتہائی حساسیت کا ایک ثبوت ہے[۴]۔

آیئے اس واقعے کی تفصیلات پر غور کریں۔ ۱۹۱۳ء کا سال برطانوی استعمار کی چیرہ دستیوں کا ایک ایسا دور تھا جب ہندوستان کے مسلمانوں کو نئی جدوجہد کی طرف مائل کیا گیا۔ اتر پردیش، جسے اُس وقت صوبۂ متحدہ کہا جاتا تھا، کے شہر کانپور کے مچھلی بازار علاقے میں واقع ایک مسجد کے وضو خانہ کو سڑک چوڑی کرنے کے بہانے شہید کر دیا گیا۔ یہ عمل برطانوی افسران کی طرف سے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو نظر انداز کرتے ہوئے کیا گیا تھا۔ اپریل ۱۹۱۳ء میں مسلمانوں کی طرف سے وکیل شاہد حسین کے ذریعے سر جیمز میسٹن، جو اس وقت صوبۂ متحدہ کے نائب گورنر تھے، کو ایک درخواست پیش کی گئی۔ اس درخواست میں مسجد کے کسی بھی حصے کو ہٹانے کی مخالفت کی گئی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ ہٹایا جانے والا حصہ مسجد کا لازمی اور مقدس جزو ہے[۵]۔

۶ مئی ۱۹۱۳ء کو سر جیمز میسٹن نے درخواست گزاروں کو جواب بھیجا کہ وضو خانہ مسجد کا مقدس حصہ نہیں ہے کیونکہ وہاں جوتوں کے ساتھ داخل ہوتے ہیں، اس لیے اسے ہٹایا جائے گا اور بلدیہ کی طرف سے متبادل جگہ پر نیا وضو خانہ تعمیر کیا جائے گا[۶]۔ ۲۰ جولائی ۱۹۱۳ء کو سر جیمز میسٹن خود کانپور آئے، مسجد کا معائنہ کیا، مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مکمل طور پر نظر انداز کیا، اور اپنا فیصلہ برقرار رکھا۔ اس کے نتیجے میں یکم جولائی ۱۹۱۳ء کے آس پاس وضو خانہ ہٹا دیا گیا۔ مقامی سطح پر اس فیصلے کی نگرانی اور عمل درآمد کی ذمہ داری ضلع مجسٹریٹ ٹیلر کے پاس تھی، جنہیں میسٹن نے پہلے ہی سخت ہدایات دی تھیں کہ امن برقرار رکھنے کے لیے ضروری اقدامات کریں اور اگر اضافی پولیس کی ضرورت ہو تو طلب کریں[۷]۔

---

[۴] پرناو، مارگریٹ، کانپور ۱۹۱۳: خدا کے گھر کے لیے پرجوش جذبات کا اظہار۔ نوآبادیاتی ہندوستان میں جذبات اور جدیدیت: توازن سے جوش تک میں، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس: ۲۰۱۹۔
https://academic.oup.com/book/36625/chapter/321616666

[۵] یانک، ایم (۱۹۷۴)۔ کانپور مسجد واقعہ ۱۹۱۳ء۔ دی مسلم ورلڈ، ۶۴ (۳)، ۱۸۷، ۲۰۳
https://doi.org/10.1111/j.1478-1913.1974.tb03168.x

[۶] ماخذ سابق

[۷] لوان، ایس (۱۹۷۴)۔ کانپور مسجد واقعہ ۱۹۱۳ء: شمالی ہندوستانی مسلم پریس اور کمیونٹی بحران پر اس کا ردعمل۔ جرنل آف

مسلمانوں نے مقامی رہنماؤں کی قیادت میں متعدد درخواستیں دائر کیں، لیکن برطانوی حکام نے ان کی بات نہ سنی۔ اس کے نتیجے میں شدید احتجاج شروع ہوا۔ ۳/ اگست ۱۹۱۳ء کو احتجاج شدت اختیار کر گیا۔ مسلمان عید گاہ میں جمع ہوئے، سیاہ جھنڈے لہراتے ہوئے مسجد کی طرف مارچ کیا اور ہٹائے گئے حصے کو دوبارہ تعمیر کرنے کی کوشش کی۔ ضلع مجسٹریٹ ٹیلر نے مظاہرین کو منتشر ہونے کا حکم دیا، ناکامی پر پولیس نے فائرنگ کی۔ فائرنگ تقریباً پندرہ منٹ تک جاری رہی، تقریباً چھ سو گولیاں استعمال ہوئیں، اور رسمی رپورٹس کے مطابق بیس سے تیس مسلمان شہید یا زخمی ہوئے (بعض مسلم روایات میں تعداد زیادہ بتائی جاتی ہے)۔ یہ سانحہ پورے ہندوستان میں مذمت کا سبب بنا اور بعد ازاں وائسرائے ہند لارڈ ہارڈنگ نے اسے "احمقانہ غلطی" قرار دیتے ہوئے مسجد کا حصہ دوبارہ بحال کروایا[۸]۔

شہداء کی لاشیں دریائے گنگا میں پھینک دی گئیں، جو ایک سنگین ظلم تھا۔ یہ سانحہ تاریخ میں "کانپور مسجد ٹریجڈی" یا "کربلائے کانپور" کے نام سے جانا جاتا ہے[۹]۔ پرانے رسائل، جرائد اور یادداشتوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ صرف ایک مسجد کی تباہی نہیں تھی، بلکہ مسلمانوں کی مذہبی آزادی پر حملہ تھا۔ برطانوی حکومت نے اسے "ترقی" کا نام دیا، لیکن حقیقت میں یہ مسلمانوں کو دبانے کی کوشش تھی یا شاید یہ ایک ٹیسٹ تھا جس کے ذریعے دیکھا جا رہا تھا کہ مسلمانوں میں دینی حمیت کس حد تک باقی رہ گئی ہے۔ یہ واقعہ شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک بحران تھا، جس نے انہیں متحد کیا اور سامراج مخالف جذبات کو ابھارا۔ بعد میں یہ سانحہ خلافت تحریک کا پیش خیمہ بنا اور برطانوی راج کے خلاف مزاحمت کی ایک مستقل بنیاد بنی[۱۰]۔

اس سانحے پر علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ شبلی جیسے عظیم رہنماؤں نے شدید

دی امریکن اکیڈمی آف ریلیجن، ۴۲(۲)، ۲۶۳–۲۷۹۔ https://doi.org/10.1093/jaarel/XLII.2.263

[۸] ہسٹری پاک (بغیر تاریخ)، کانپور مسجد سانحہ (۱۹۱۳) : https://historypak.com/kanpur-mosque-tragedy-1913

[۹] وان، ایس (۱۹۷۴)، کانپور مسجد سانحہ ۱۹۱۳: شمالی ہندوستانی مسلم پریس اور کمیونٹی بحران پر اس کا ردعمل، جلد ۴۲، شمارہ ۲، صفحات ۲۷۹، ۲۶۳۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی جانب سے شائع کردہ : https://academic.oup.com/jaar/article-abstract/XLII/2/263/800495

[۱۰] احمد، ف-ع (۲۰۲۰)، سانحہ مسجد کانپور : مسلم اردو صحافت کا ردعمل اور شعری منظر نامہ۔ امتزاج: اردو ریسرچ جرنل، ۱۳(۱۳)۔ https://imtezaaj.uok.edu.pk/website/journal/article/6111486ac4d52/page

ردّ عمل کا اظہار کیا۔ علامہ اقبال نے کانپور جا کر مسلمانوں کی حمایت کی اور اسے ملت اسلامیہ کے لیے ایک عظیم المیہ قرار دیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے جریدے "الہلال" نے "مشہد اکبر" کے عنوان سے کئی قسطوں میں طویل مضامین شائع کیے۔ ان میں سے ایک مضمون سید سلیمان ندوی نے بھی لکھا، جس کی پاداش میں "الہلال" کی ضبطی ہوئی اور اخبار پر جرمانہ عائد کیا گیا[۱۱]۔ اس وقت کے اخبارات اور تاریخی دستاویزات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ احتجاج مقامی سطح تک محدود نہیں رہا بلکہ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کو متحد کرنے کا سبب بنا۔ قائدین عوام کے ساتھ تھے، انھوں نے ان کی تکلیف کو محسوس کیا اور ان کی جدوجہد میں ان کے ساتھ شریک رہے۔ یہ دور ایسا تھا جب مذہبی آزادی کی حفاظت کو قومی جدوجہد کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔

معاملے کی شدت اور اس کے تئیں ہمارے اکابرین کی حساسیت اور سنجیدگی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے اکابرین کو ہر سطح پر بے چین کر دیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے ایک تحقیقی مقالے میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۱۳ء کا کانپور مسجد واقعہ علامہ اقبال کو شدید متاثر کرنے والے سانحات میں سے ایک تھا، جس نے ان کی پوزیشن کو برطانوی حکومت کے خلاف مزید مضبوط کیا اور انہیں مسلمانوں کی بقا اور خود انحصاری کی طرف متوجہ کیا۔ علامہ اقبال خواجہ حسن نظامی کے ہمراہ کانپور گئے اور وہاں کے کلکٹر سے ملاقات کی اور مسجد کے حصے کی شہادت کے معاملے پر اپنا احتجاج درج کرایا۔[۱۲]

اسی طرح مولانا شبلی نعمانی پر بھی اس سانحے کا گہرا اثر پڑا، جس کا اظہار انہوں نے تقریباً بارہ نظموں کے ذریعے اپنے سوزِ دروں کی صورت میں کیا۔ ان نظموں میں سیاسی اور ملی دونوں پہلو نمایاں ہیں: سیاسی سطح پر برطانوی سامراج کے خلاف نفرت اور احتجاج، اور ملی سطح پر ملتِ اسلامیہ ہند سے ہمدردی اور اسلامی شعائر، خصوصاً مسجد کے انہدام پر شدید رنج والم کا اظہار۔ ان کی ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے

---

[۱۱] نامعلوم مرتب (۱۹۵۷)۔ نوائے آزادی، مشہد اکبر، سید سلیمان ندوی۔ ممبئی: ادبی پبلشرز، ص ۱۱۸

[۱۲] اسراء سرور، زبیدہ ظفر (۲۰۱۹)۔ علامہ محمد اقبال ہندوستان کی سیاست میں۔ جرنل آف انڈین اسٹڈیز، ۵(۲)، ۴۔ پنجاب یونیورسٹی، لاہور:
https://pu.edu.pk/images/journal/indianStudies/PDF/4_v5_2_19.pdf

دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خوردسال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لیے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آ گئی ہے، منتظر نفخ صور ہیں
کچھ پیر کہنہ سال ہیں، دلدادۂ فنا
جو خاک و خون میں بھی ہمہ تن غرق نور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا
ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں[۱۳]

جب یہ واقعہ پیش آیا تو اس وقت مولانا شبلی نعمانی بمبئی میں مقیم تھے، اور انہیں اس امر کا شدید افسوس رہا کہ وہ کشتگانِ کانپور میں شامل نہ ہو سکے۔ اس داخلی کرب اور حسرت کا اندازہ ان کے اس شعر سے بخوبی ہوتا ہے، جس میں وہ خود کو اس سعادت سے محروم قرار دیتے ہیں:

شہیدان وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں
کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محروم سعادت ہے[۱۴]

اس سانحے کو مولانا شبلی نعمانی نے نظم "آپ ظالم نہیں زنہار، پہ ہم ہیں مظلوم" میں نہایت غم انگیز اور پُراثر انداز میں بیان کیا ہے۔ اس نظم میں طنزیہ اسلوب کے ذریعے عدل و قانون کے دعوؤں اور عملی مظالم کے تضاد کو نمایاں کیا گیا ہے۔ مسجد کے منبر و محراب پر گولیوں کے نشانات، بے گناہ نوجوانوں کی شہادت اور نوآبادیاتی جبر کی شدت کو واضح کرتے ہیں۔ نظم کا مرکزی مصرع پوری صورتِ حال کو سمیٹتے ہوئے سیاسی احتجاج اور ملی مظلومیت کا جامع اظہار بن جاتا ہے:

ہم غریبوں کو نہ پہلے تھا نہ اب ہے انکار
ہے ہر اک شہر میں آپ کے انصاف کی دھوم
یہ بھی تسلیم ہے ہم کو کہ یہ جو کچھ بھی ہوا

---

[۱۳] شبلی نعمانی، کلیاتِ شبلی اردو، کراچی: ادارۂ اشاعت، ص. ۸۶
[۱۴] ماخذ سابق، ص ۸۵

اس میں ملحوظ رہے عدل کے آداب و رسوم
آپ قانون کی حد سے نہ بڑھے یک سرِ مو
فیر کا حکم دیا آپ نے جب بحرِ ہجوم
گولیاں کھا کے جو گرتے تھے جوانانِ حسیں
سب یہ کہتے تھے قیامت ہے کہ جھڑتے ہیں نجوم
گولیوں کے تھے نشاں منبر و محراب پہ بھی
بسکہ درکار ہے مسجد کے لیے نقش و رسوم
جا بجا خون سے مسجد ہے نگاریں اب تک
یہ صفت وہ ہے کہ تا حشر نہ ہو گی معدوم
پا بہ زنجیر تھے، مجرم بھی تماشائی بھی
اور پولیس کو تھا یہ عذر کہ ہم ہیں محکوم
واقعہ یہ ہے، غرض کوئی نہ مانے نہ سہی
آپ ظالم نہیں زنہار، پہ ہم ہیں مظلوم[۱۵]

مولانا ابوالکلام آزاد نے اس سانحے کی تاریخ بیان کرتے ہوئے بڑے واضح انداز میں لکھا:

یکم جولائی کی تاریخ مسلمان کبھی نہیں بھول سکتے، جب کہ بندوقوں اور سنگینوں کے حصار میں کان پور کی مسجد کا ایک مقدس حصہ شہید کر دیا گیا اور اس طرح پورے فوجی ساز و سامان کے ساتھ اس اعلان کردہ مذہبی آزادی کا جنازہ اٹھا جس کے پتلے کو ایک صدی سے زائد عرصے تک ہندوستان میں زندہ و متحرک دکھلایا گیا تھا[۱۶]۔

اس خونیں سانحے نے بہ قول سید سلیمان ندوی "تمام ہندوستان کو خونیں بنا دیا تھا"[۱۷]۔ اس معرکے میں مسلمانان کان پور نے انگریز تسلط کی صد سالہ تاریخ میں پہلی بار بے پناہ عزم کا

---

[۱۵] ماخذ سابق، ص ۸۵

[۱۶] ابوالکلام آزاد، شہدائے کانپور: لکھنؤ کا مجوزہ جلسہ: الہلال، (۳ ستمبر ۱۹۱۳ء) ص ۱۴

[۱۷] رئیس احمد جعفری، کاروان گم گشتہ، بحوالہ سید سلیمان ندوی، ص ۶۰۱

مظاہرہ کر کے جنوبی ایشیا میں فرنگیوں کی حکومت کی بنیادیں ہلا دیں[۱۸]۔ سیاسی اعتبار سے یہ معرکہ جنوبی ایشیا میں انگریزی اقتدار کے خلاف کھلی محاذ آرائی کے طور پر سامنے آیا اور اہلِ ہند پر یہ بات آشکار ہو گئی کہ انگریز پر یہ بات آشکار ہو گئی کہ انگریزی حکومت کا غلبہ نا قابل تسخیر نہیں ہے[۱۹]۔ عوام کے جذبات مشتعل ہوئے تو ملک کے طول و عرض میں شدید بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ کہنے کو تو یہ ایک مسجد کا واقعہ تھا لیکن اس کی تہہ میں آزادی اور حریت پرستی کا جذبہ کام کر رہا تھا[۲۰]۔ یہاں پر مشتے از خروارے کے طور پر چند لوگوں کے ہی اقوال نقل کیے گئے ہیں ورنہ اور بھی اکابرین کے بیانات رسائل و جرائد میں ملتے ہیں جس سے اس واقعے کی حساسیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

آج ہندوستان ایک بار پھر اس جیسے ایک نہیں متعدد مناظر پیش کر رہا ہے۔ مساجد، مدارس اور مزارات پر بلڈوزر چلائے جا رہے ہیں، مذہبی جگہوں کو غیر قانونی قرار دے کر گرایا جا رہا ہے، ان عمارتوں کی جگہ کو تحویل میں لیا جا رہا ہے اور مسلمانوں کی مذہبی آزادی پر قدغنیں لگائی جا رہی ہیں۔ خاص طور پر بی جے پی کی زیر قیادت ریاستوں میں، "بلڈوزر جسٹس" کی سیاست کے ذریعے مسلمانوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ لیکن افسوس کہ کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ نریندر مودی کے ۲۰۱۴ء میں وزیر اعظم بننے کے بعد سے آج تک ہندوستان میں مساجد کو تباہ کرنے کے بارے میں کوئی سرکاری یا جامع اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں لیکن آئے دن مسلمانوں کے خلاف اقدامات سے خبریں بھری پڑی ہوتی ہیں جن میں ذاتی مکان، کاروبار، مدارس، مساجد، درگاہیں اور مزارات کو منہدم کرنے کی خبریں ہوتی ہیں[۲۱]۔ زیادہ تر کارروائیاں "انکروچمنٹ" یعنی غیر قانونی قبضے یا تجاوزات ہٹانے کے نام پر کی جا رہی ہیں۔ انسانی حقوق کی تنظیمیں ان اقدامات کو مسلمانوں کے خلاف امتیازی کارروائی قرار دے چکی ہیں۔ افسوس کہ کوئی ملی تنظیم ان واقعات کی تفصیلات ریکارڈ نہیں کر رہا ہے اور اب سے چند سال بعد بہت سے واقعات کے ریکارڈ کا کوئی وجود نہیں ہو گا۔

---

[۱۸] اشتیاق اظہر، ماخذ سابق، ص ۴۳-۴۴

[۱۹] کریم احمد، مراسلات، مشمولہ الہلال، (۲۲ اکتوبر ۱۹۱۳)، ص ۳۴

[۲۰] گوپی چند نارنگ، ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ص ۳۳۶

[۲۱] ہیومن رائٹس واچ (۲۰۲۵)۔ ورلڈ رپورٹ ۲۰۲۵: انڈیا۔ World Report 2025:India
https://www.hrw.org/world-report/2025/country-chapters/india

پھر بھی دستیاب اعداد و شمار کے مطابق، مساجد، مزارات اور درگاہوں سے متعلق کل تخمینی تعداد تقریباً ۵۰۰ سے زائد مقدمات پر مشتمل ہے۔ کوئی مرکزی ڈیٹا بیس نہ ہونے کے باعث یہ تعداد کم یا زیادہ ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر، تحقیق اور صحافت سے متعلق رپورٹیں شائع کرنے والے ادارے دی پولیس پروجیکٹ کی ۲۰۲۵ء کی رپورٹ میں ۵۸ مساجد کو زیرِ تنازعہ قرار دیا گیا ہے، جن میں سے کئی کو قانونی طور پر چیلنج کیا گیا ہے[۲۲]۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی ۲۰۲۴ء کی رپورٹ کے مطابق، ۲۰۲۲ء کے بعد ۱۲۸ مسلم املاک، جن میں عبادت گاہیں بھی شامل ہیں، تباہ کی گئیں[۲۳]۔ اسی طرح، ساؤتھ ایشیا جسٹس کیمپین کی ۲۰۲۵ء کی رپورٹ میں بتایا گیا کہ ۲۰۲۴ء میں ۴۰۰,۷ گھروں کو تباہ کیا گیا، جن میں ۳۷ فیصد مکان مسلمانوں کے تھے[۲۴]۔

تفصیلات کے مطابق، ۲۰۱۴ء سے ۲۰۱۷ء کے درمیان کوئی واضح یا جامع اعداد دستیاب نہیں ہیں، تاہم اس دور میں تنازعات کا آغاز ہوا، قانونی مشکلات سامنے آئیں اور بی جے پی کے اقتدار میں اضافے کے ساتھ تشدد کے واقعات بڑھے[۲۵]۔ ۲۰۱۸ء میں اتر پردیش کے متھرا میں سات

---

[۲۲] دی پولیس پروجیکٹ (۲۰۲۵)۔ ہندوستان میں مساجد کو منظم طریقے سے کیسے نشانہ بنایا جا رہا ہے:
https://thepolisproject.com/read/india-mosques-islamic-shrines-targeted-demolition

[۲۳] ایمنسٹی انٹرنیشنل۔ (۲۰۲۴)۔ "اگر آپ بولیں گے تو آپ کا گھر گرا دیا جائے گا": ہندوستان میں بلڈوزر ناانصافی: (انڈیکس: ASA 20/7613/2024)۔ حاصل کردہ از
https://www.amnesty.org/en/documents/asa20/7613/2024/en/

[۲۴] ساؤتھ ایشیا جسٹس کیمپین (۲۰۲۵)۔ انڈیا پرسی کیوشن ٹریکر ۲۰۲۵: سالانہ جائزہ:
https://southasiajusticecampaign.org/ipt2025

[۲۵] دی گارڈین (۲۰۲۲)۔ ہندو قوم پرستوں کی جانب سے ہندوستان کی تاریخ کو از سرِ نو لکھنے کی کوششوں کے دوران ہزاروں مساجد کو نشانہ بنایا گیا:
https://www.theguardian.com/world/2022/oct/30/thousands-of-mosques-targeted-as-hindu-nationalists-try-to-rewrite-indias-history
مزید کے لیے دیکھیں، کونسل آن فارن ریلیشنز۔ (۲۰۲۰)۔ ہندوستان کے مسلمان: تیزی سے حاشیے پر جاتی ہوئی ایک آبادی:
https://www.cfr.org/backgrounders/india-muslims-marginalized-population-bjp-modi

مزارات کو تباہ کیے جانے کی اطلاعات ملتی ہیں[۲۶]۔ ۲۰۱۹ء اور ۲۰۲۰ء کے دوران ۱۴ سے زائد مساجد کو جلائے جانے کے واقعات پیش آئے، اگرچہ ان میں بلڈوزر کا استعمال نہیں ہوا، جبکہ دہلی فسادات میں ۱۹ مساجد اور ایک درگاہ کو نقصان پہنچا اور مجموعی طور پر تشدد میں اضافہ دیکھا گیا[۲۷]۔ ۲۰۲۱ء میں اتر پردیش کے بارہ بنکی میں ایک مسجد کو تباہ کیا گیا[۲۸]۔ ۲۰۲۲ء میں ۱۲ سے زائد مزارات اور ۲۰ سے زائد مساجد و مدارس کو سرحدی علاقوں میں نشانہ بنایا گیا، کانپور میں ایک مزار کو نقصان پہنچا، جبکہ اتر پردیش-نیپال سرحد پر تقریباً ۲۰ مساجد اور مدارس کو تباہ کیا گیا۔ ایمنسٹی کے مطابق ۲۰۲۲ء سے پانچ ریاستوں یعنی آسام، دہلی، گجرات، مدھیہ پردیش اور اتر پردیش میں ۱۲۸ مسلم پراپرٹیز کی تباہی کا آغاز ہوا[۲۹]۔

۲۰۲۳ء اور ۲۰۲۴ء کے دوران اتراکھنڈ میں ۳۰۰ سے زائد مزارات کو بلڈوز کیا گیا، دہلی میں ۱۵ سے زائد درگاہوں کو نشانہ بنایا گیا اور کم از کم ایک مسجد کو نقصان پہنچا، پریاگ راج میں ۲۰۲۳ء میں شاہی مسجد اور دہلی میں ۲۰۲۴ء میں ایک قدیم مسجد کے ڈھانے کے واقعات سامنے آئے،

---

[۲۶] دی پولیس پروجیکٹ۔ (۲۰۲۵)۔ ہندوستان میں مساجد اور اسلامی مزارات کو منظم طریقے سے نشانہ بنانے کا عمل: https://thepolisproject.com/read/india-mosques-islamic-shrines-targeted-demolition

[۲۷] اسکرول ڈاٹ اِن (۲۰۲۰)۔ دہلی فسادات کے دوران مذہبی مقامات کو پہنچنے والا نقصان: https://scroll.in/article/952807/delhi-riots-places-of-worship-damaged؛ دی ہندو (۲۰۲۰)۔ دہلی فسادات: مساجد اور درگاہوں کو پہنچنے والا نقصان۔ حاصل کردہ از https://www.thehindu.com/news/cities/Delhi/delhi-riots-mosques-damaged/article30969426.ece

[۲۸] دی پولیس پروجیکٹ (۲۰۲۵)۔ ہندوستان میں مساجد کو منظم انداز میں نشانہ بنانا: https://thepolisproject.com/read/india-mosques-islamic-shrines-targeted-demolition

[۲۹] مکتوب میڈیا (۲۰۲۲)۔ ہندوستان میں مساجد اور مزارات کے خلاف کارروائیاں: سرحدی علاقوں کی رپورٹ: https://www.maktubmedia.in/2022/annual-report-muslim-properties-india؛ ایمنسٹی انٹرنیشنل (۲۰۲۴)، "اگر آپ آواز اٹھائیں گے تو آپ کا مکان مسمار کر دیا جائے گا": ہندوستان میں بلڈوزر انصاف (Index: ASA 20/7613/2024): https://www.amnesty.org/en/documents/asa20/7613/2024/en/

جبکہ ۲۰۲۴ء میں ۷,۴۰۰ گھروں کی تباہی رپورٹ ہوئی جن میں ۷۳ فیصد مسلمانوں کے تھے[۳۰]۔

۲۰۲۵ء میں جنوری سے جون تک مساجد اور مزارات گرانے کے کم از کم ۱۵ واقعات رپورٹ ہوئے جن میں دو سے زائد مساجد شامل تھیں۔ احمد آباد میں ۴۰۰ سال پرانی مسجد کو اکتوبر میں جزوی طور پر بلڈوز کیا گیا۔ سنبھل میں ایک مسجد اکتوبر میں نشانہ بنی، فتح پور میں اگست میں ایک مزار کو نقصان پہنچا۔ بیت دوارکا میں جنوری میں ۱۲ مذہبی ڈھانچوں کو مسمار کیا گیا اور اجین میں جنوری میں تکیہ مسجد کا واقعہ پیش آیا، جبکہ اسی سال ۵۸ مساجد کو زیرِ تنازعہ بتایا گیا[۳۱]۔

جنوری ۲۰۲۶ء میں متعدد نئے واقعات سامنے آئے، مثلاً دہلی کے ترکمان گیٹ میں فیض الٰہی مسجد کے آس پاس میونسپل کارپوریشن آف دہلی کی طرف سے شروع کی گئی مسماری مہم، جس میں تشدد ہوا اور پولیس افسران زخمی ہوئے؛ شمالی ہندوستان میں ایک مسجد اور اسلامی مدرسہ کی تباہی جو مسلمانوں میں خوف کا باعث بنی؛ اور وارانسی میں دال منڈی روڈ کی توسیع کے لیے متعدد مساجد سمیت جائیدادوں کا ممکنہ انہدام۔ حکومت کے ان جارحانہ اور متعصبانہ اقدامات کے رجحان کے جاری رہنے کے مزید شواہد موجود ہیں اور انسانی حقوق کی تنظیموں کی طرف سے ان پر مستقل مذمت کی جارہی ہے۔

۲۰۱۷ء سے ۲۰۲۲ء کے درمیان مسماری میں ۳۷۹ فیصد اضافہ دیکھا گیا۔ ان میں سے اکثر واقعات کو حکمراں جماعت بی جے پی نے مسلمانوں کو "سبق سکھانے" اور ان کے آباء واجداد کے پرانے حساب چکانے کے ثبوت کے طور پر استعمال کیا ہے[۳۲]۔ یہ رجحان خاص طور پر بی جے پی کے زیرِ اقتدار ریاستوں میں زیادہ نمایاں ہے، جہاں پلیسز آف ورشپ ایکٹ ۱۹۹۱ء، جس کے

---

[۳۰] دی پولیس پروجیکٹ (۲۰۲۵)۔ ہندوستان میں مساجد اور اسلامی مزارات کو منظم طور پر نشانہ بنایا جانا:
https://thepolisproject.com/read/india-mosques-islamic-shrines-targeted-demolition

[۳۱] ماخذ سابق ملاحظہ فرمائیں: دی پولیس پروجیکٹ اور ساؤتھ ایشیا جسٹس کیمپین کی رپورٹیں۔

[۳۲] دی ٹائمز آف انڈیا (۷ جنوری ۲۰۲۶)۔ دہلی ڈیمولیشن ڈرائیو: فیض الٰہی مسجد کے قریب ایم سی ڈی کی کارروائی؛ ۵ پولیس اہلکار زخمی:
https://timesofindia.indiatimes.com/city/delhi/delhi-demolition-drive-mcd-carries-out-action-near-faiz-e-elahi-masjid-following-hc-order-5-cops-injured-in-stone-pelting/articleshow/126384871.cms

مطابق کسی بھی مذہبی مقام کی اس حیثیت کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا جو پندرہ اگست ۱۹۴۷ کو تھی، کو نظر انداز کرتے ہوئے ہندو مندروں کو توڑ کر بنائے جانے کا الزام لگا کر، نشانہ بنایا گیا۔ تاہم سرکاری ریکارڈ میں ان واقعات کو عموماً سڑکوں کی توسیع، تجاوزات یا تاریخی دعووں پر مبنی بتایا جاتا ہے جبکہ انسانی حقوق کی تنظیمیں ان اقدامات کو مسلمانوں کی ثقافتی اور مذہبی شناخت کو مٹانے کی کوشش قرار دے رہی ہیں۔ ان کارروائیوں کے نتیجے میں ہزاروں افراد بے گھر ہوئے، مثلاً ۲۰۲۴ء میں تقریباً ۴۱ ہزار افراد سروں پر چھت سے محروم ہوگئے۔ اکثر فسادات یا احتجاج کے بعد "بلڈوزر جسٹس" کے نام پر یہ کارروائیاں کی گئیں۔ ایمنسٹی اور دیگر تنظیموں نے تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ اقدامات غیر قانونی اور منتخب نوعیت کے ہیں، جن میں ہندوؤں کی املاک کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ سپریم کورٹ نے ۲۰۲۴ء میں متعدد مقدمات میں ایسی کارروائیوں پر روک لگائی، تاہم عملی طور پر یہ سلسلہ مختلف شکلوں میں جاری ہے[۳۳]۔

موجودہ قائدین کی خاموشی کی وجہ شاید سیاسی دباؤ ہے، کیونکہ نام نہاد اور خود ساختہ مسلم قیادت منظر سے غائب ہے۔ آج کے حالات میں، بلڈوزر کی سیاست نے ہندوستان کو ایک نئی شکل دے دی ہے، جہاں قانون کے نام پر اقلیتوں کو نشانہ بنایا جارہا ہے۔ تب لوگ چیختے تھے، قائدین سامنے آتے تھے، اب یہ معمول ہے اور کوئی صدا سنائی نہیں دیتی۔

یہاں پر صرف سوال یہ نہیں کہ مساجد کتنی گریں یا کب بلڈوزر چلے، سوال یہ ہے کہ قوم کی اجتماعی غیرت، قیادت کی اخلاقی جرأت اور مذہبی آزادی کے تصور کا کیا ہوا؟ اگر ۱۹۱۳ء میں ایک مسجد کے وضو خانے کی شہادت نے پورے ملک کے مسلمانوں کو جھنجھوڑ دیا تھا، تو آج سینکڑوں مساجد، مزارات اور گھروں کی مسماری پر ہماری غیرت جوش کیوں نہیں مارتی؟ شاید اصل المیہ یہی ہے کہ اب صرف عمارتیں نہیں گر رہیں، ضمیر، روایتِ احتجاج، مزاحمت اور قیادت کا تصور بھی ملبے تلے دب چکا ہے۔

---

[۳۳] آرٹیکل ۱۴ (دسمبر ۲۰۲۳)۔ ہندوستان میں بلڈوزر کے استعمال میں پانچ سال میں ۳۷۹ فیصد اضافہ: سزا دینے والا اور اکثریتی رجحان:
https://article-14.com/post/demolitions-are-not-new-to-india-but-a-379-rise-in-5-years-reveals-a-punitive-majoritarian-turn-to-bulldozer-use-695dd1a02c376

تبصرۂ کتب

مفتی محمد نظام الدین رضوی، جدید مسائل پر علماء کی رائیں اور فیصلے (جلد پنجم): قدرے بڑی تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات: ۵۵۲، قیمت: درج نہیں، سال اشاعت: ۲۰۲۴ء، پتہ: مجلس برکات جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ۔

شرعی اور فقہی موضوعات میں وقت کے تقاضوں نے جدید مباحث کو ہمیشہ پیش نظر رکھنے، پیش آمدہ مسائل اور مشکلات کو حل کرنے اور امت کی رہنمائی کرنے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ موجودہ دور کے ہر لمحہ انقلاب پذیر معاشرے میں اس ادائے فرض میں علماء وفقہاء کی ذمہ داریوں میں اور اضافہ ہوا ہے۔ مشہور درس گاہ جامعہ اشرفیہ کی مجلس شرعی بھی اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ اب تک اس مجلس نے بیسیوں فقہی سمینار منعقد کیے جن میں قضایا ومسائل کے حل کے لیے فیصلے سامنے آتے رہے۔ ان کی اشاعت کا مسلسل اہتمام ہوتا رہا۔ زیر نظر مجموعہ اسی سلسلے کی پانچویں کڑی ہے جس میں فاریکس ٹریڈنگ، میٹریل کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ کے ساتھ تعمیر کا ٹھیکہ، لائف سپورٹ سسٹم، پوسٹ مارٹم کی شرعی حیثیت اور سرجری کی تعلیم کے لیے لاوارث لاشوں کی چیر پھاڑ جیسے موضوعات پر بحث کی گئی۔ اس بحث میں پہلے سوالنامے جاری ہوتے ہیں، جوابات کا خلاصہ کیا جاتا ہے، پھر تنقیح طلب سوالات طے کیے جاتے ہیں، پھر فیصلہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ مثلاً فاریکس ٹریڈنگ کیا ہے؟ اور ایک ملک کی کرنسی دوسرے ملک کی کرنسی سے آن لائن خریدنا، بیچنا کیا ہے؟ فساد یا بطلان کی صورت میں اس کے جواز کے لیے کوئی شرعی حل یا حیلہ ممکن ہے یا نہیں؟ ان سوالات کے جواب میں مطلوب مقالات کا اور پھر فیصلہ کا خلاصہ پیش کیا گیا کہ ایک ملک کی کرنسی سے دوسرے کسی بھی ملک کی کرنسی کی خرید وفروخت شرعاً عقد بیع ہے۔ دوسری شق میں بتایا گیا کہ ناتجربہ کار اور غیر ماہر لوگ اس طرح کی خرید وفروخت میں حصہ نہ لیں اور ماہرین جو اپنے فائدے کا گمان غالب رکھتے ہیں، شرعاً یہ خرید وفروخت کر سکتے ہیں مگر یہاں قانوناً اس سے ممانعت ہے اس لیے وہ بھی پرہیز کریں۔ اس خلاصہ کے بعد اجمالاً کچھ اور بھی وضاحت کر دی گئی اور یہ وضاحت سے زیادہ اس قسم کی خرید وفروخت میں عموماً خسارے کی بابت تنبیہ ہے۔ البتہ یہ جملہ کہ یہاں قانوناً اس کی تجارت کی ممانعت ہے۔ وضاحت طلب ہے، یہاں سے کیا مراد ہے؟ بظاہر ہندوستان مراد ہے تو پھر فتویٰ کیا عام کی جگہ محدود اور خاص ہے؟ اگر ایسا ہے تو کہاں یہ عام ہو سکتا ہے اور کہاں محدود؟

اس کی وضاحت غالباً بہتر ہوتی۔ اسی طرح تعمیراتی ٹھیکہ کے باب میں بتایا گیا کہ ٹھیکے کا یہ معاملہ عقد اجارہ ہے، اس کے ضمن میں بیع بھی پائی جاتی ہے۔ جتنے پر ٹھیکہ ہوا اتنے پر کام پورا کرانا ٹھیکے دار پر لازم ہے۔ اس مسئلہ میں بھی گومگو کی صورت ہے جیسے ”ٹھیکہ حاصل کرنے کے لیے حکام کو اگر کچھ نہ دیا جائے تو ٹھیکہ ملنا مشکل ہے۔ ایسی حالت میں اگر مسلمان اس کاروبار سے یکسر دست کش ہو جائیں تو مزید معاشی پس ماندگی کا شکار ہو سکتے ہیں، جبکہ معاشی استحکام حاصل کرنا ان کا حق ہے اس لیے اگر کچھ دے کر اپنا حق حاصل کریں تو وہ گنہگار نہیں“۔ صاف ظاہر ہے کہ مسائل میں ضرورت کے مطابق وقتی تقاضوں میں لچک کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ کے مرتب شیخ الحدیث ہیں اور شعبۂ افتاء کے صدر بھی ہیں اور فقہی مسائل میں اپنے مطالعہ کے لیے شہرت رکھتے ہیں۔ اس لیے اس مجموعہ کے فیصلوں سے دوسرے ممکن ہے اتفاق نہ کریں لیکن اعتبار ضرور کر سکتے ہیں۔ کتاب میں سابقہ فقہی مذاکرات کی کارروائیوں، مجلس شرعی کی خدمات اور قریب چوّن ان فقہاء کے حالات بھی ہیں جو ان سمیناروں میں شریک ہوتے رہے اور اب وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ مجلس شرعی یقیناً اس مجموعہ کی اشاعت کے لیے لائق تحسین ہے۔ (عمیر الصدیق ندوی)

ڈاکٹر مرزا ندیم بیگ، مسلم پٹی تاریخ کے آئینے میں: متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۱۷۶، قیمت: ۳۵۰ روپے، سن اشاعت: ۲۰۲۳ء، پتہ: بھارت میڈیکل اسٹور، سرائے میر، اعظم گڑھ، یوپی، موبائل نمبر: ۹۱۱۸۳۷۷۳۸۷

عموماً عمرانی تاریخ کے صفحات دارالسلطنت یا پھر چند بڑے شہروں کے لیے وقف ہوتے ہیں کچھ مقامات بھی تاریخی بیانات کا حصہ بنتے ہیں جہاں اہم جنگیں ہوئیں یا پھر وہ آبادیاں بھی ضمناً اس میں شامل ہوتی ہیں جو کسی بڑی شخصیت سے انتساب رکھتی ہیں۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی بستیوں کے دامن میں کثرت سے ایسے واقعات اور اشخاص ملتے ہیں جو اپنے کارناموں کے لحاظ سے تاریخ کی اہمیت کا سبب بن جاتے ہیں۔ اودھ کے قصبات اس کی مثال ہیں، اسی طرح شیر ازہند کے خطے کی بہت سی آبادیاں ہیں جن کے سینے میں انسانی وجود کی عجب عجب کہانیاں موجود و محفوظ ہیں۔ اعظم گڑھ میں ایک چھوٹی سی بستی مسلم پٹی کے نام سے ہے۔ ایک شخص مرزا محمد مسلم نے اس قطعۂ ارض کو اپنے نام سے پہچان دی سینکڑوں سال بعد کس کو یہ خبر کہ محمد مسلم کے آباء و اجداد چیچنیا سے آئے، فرغانہ کی وادی میں رکے اور بابر کے قافلہ سرفروشاں

کے ساتھ ہندوستان کی مٹی کا حصہ بن گئے۔ اس چھوٹے سے گاؤں نے ادیبوں، شاعروں، عالموں، معلموں، سیاست دانوں اور فوجیوں کو جس کثرت سے پیش کیا اس کی داستان واقعی بڑی دلچسپ ہے۔ مرزا احسان بیگ جیسے شاعر و نقاد سے پاکستان کے سابق چیف آف آرمی اسٹاف مرزا اسلم بیگ تک پچاسوں شخصیتیں ایسی کہ ہر ایک کا وجود، مسلم پٹی کی تابناکی کا سبب بنتا گیا۔ لائق مصنف نے خوب کیا کہ اپنی بستی کی ایک کہکشاں سجادی۔ اس طرح انہوں نے اپنے گاؤں کی مٹی کا حق ادا کر کے ایک بھولی بسری داستان کو زندگی دے دی۔ (ع۔ص)

محمد اویس سنبھلی، یادیں باتیں چہرے لوگ، صفحات ۲۴۰، نعمانی کیئر فاؤنڈیشن، لکھنؤ، ۲۰۲۵ء، قیمت:۴۰۰روپے، موبائل نمبر:۹۷۹۴۵۹۳۰۵۵۔

مصنّف اردو کے ممتاز اہل قلم مولانا محمد منظور نعمانی کے نواسے اور مشہور صحافی حفیظ نعمانی کے بھانجے ہیں۔ ان کی تربیت ایک علمی ماحول میں ہوئی۔ ان کی اب تک دس کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ بنیادی طور پر ان کا موضوع تذکرہ و سوانح ہے لیکن تنقید و تبصرہ کے فن سے ان کو اچھی واقفیت بھی ہے۔ اس کا اندازہ زیر نظر تصنیف کے مطالعے سے کیا جاسکتا ہے۔

حرف آغاز اردو صحافت کے معتبر صحافی معصوم مرادآبادی اور پیش لفظ شکیل رشید ایڈیٹر ممبئی اردو نیوز کے قلم سے ہے۔ اول الذکر نے صاحب کتاب اور مؤخر الذکر نے مصنّف کے ساتھ کتاب کی خوبی اور ان کے اسلوب کا بھی جامع تذکرہ کیا ہے۔

کتاب دو ابواب میں منقسم ہے۔ پہلا "خراج عقیدت" کے عنوان سے ہے جن میں ۱۵ مرحوم شخصیات (عرفان صدیقی، حفیظ نعمانی، پروفیسر شارب ردولوی، ایچ ایم یسین، مقصود الٰہی شیخ، سعادت علی صدیقی، منور رعنا، رمن لال اگروال، امین الدین شجاع الدین، مشرف عالم ذوقی وغیرہ) کا جذباتی تذکرہ ہے اور دوسرا "چراغ روشن ہیں" کے عنوان سے ہے جن میں ۱۰ زندہ علمی و ادبی شخصیات (احمد ابراہیم علوی، حکیم وسیم احمد اعظمی، معصوم مرادآبادی، ڈاکٹر عمیر منظر وغیرہ سمیت ۳ خواتین ڈاکٹر رضیہ حامد، ڈاکٹر صبیحہ انور، ڈاکٹر کشور جہاں زیدی) کے علمی و ادبی تاثرات پر مشتمل ہے۔ مصنّف کے مطابق زندہ لوگوں پر لکھنا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ اس طرح کے مضامین میں معلومات اور معروضیت ضروری ہے تاکہ تحریر پر کسی الجھن کا سامنا نہ ہو۔

کتاب بہ یک وقت تذکرہ بھی ہے اور تنقید بھی۔ اس میں شخصیات کا محض تعارف ہی نہیں بلکہ

ان کے اخلاقی اوصاف و کمالات کے ساتھ علمی و ادبی خدمات کا جائزہ بھی بڑی باریک بینی سے لیا گیا ہے۔ جائزے میں مصنّف معلومات کا ایک دفتر کھولتے جاتے ہیں۔ عرفان عباسی کے تذکرے میں اہل علم کو شاید پہلی بار معلوم ہو گا کہ تذکرہ شعرائے اترپردیش کی مطبوعہ ۲۷ جلدوں کے علاوہ انہوں نے ۵ جلدیں اور بھی مرتب کی تھیں جو ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔ مصنّف خود ناشر بھی ہیں اور اس سلسلے کی دو جلدیں اس سے قبل شائع بھی کر چکے ہیں۔ اس لیے ان غیر مطبوعہ جلدوں کی اشاعت پر غور کر لیتے تو بہتر ہوتا۔

کتاب میں مصنّف نے یادوں کے جو چراغ جلائے، باتوں کی جو خوشبو بکھیری اور چہرہ شناسی کے جو گُر سکھائے ہیں اس سے خود ان کی اپنی تہہ دار، عالمانہ اور ادبی شخصیت اور ممدوحین سے ان کے تعلق کی نوعیت بھی واضح طور پر سامنے آگئی ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ ہر تذکرے کی پیشانی پر ایک ایسا جملہ یا مصرعہ نقل کر دیا ہے جس میں زیر نظر شخصیت کا عکس اور نچوڑ آگیا ہے۔ جیسے عرفان عباسی کے لیے "تحقیق و تذکرہ کی ہمالیائی شخصیت"، شارب ردولوی کے لیے "پھیلا رہا تھا نور بصیرت جو مثل شمس"، منور رعنا کے لیے "لفظوں کا جادوگر"، حکیم وسیم اعظمی کے لیے "رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوق"، معصوم مرادآبادی کے لیے "کس طرح طے کی ہیں تم نے منزلیں" اور ڈاکٹر عمیر منظر کے لیے "چپ سا رہتا ہے مگر دھوم مچا دیتا ہے"۔ اس قسم کے مجموعہ ہائے مقالات میں ایسی جدت بہت کم نظر آتی ہے۔ ہر شخصیت پر ۵ سے ۱۰ یا ۱۲ صفحات مختص ہیں لیکن ڈاکٹر عمیر منظر کا ذکر ۱۵ صفحات میں کیا ہے۔

تنقیدی پہلو عموماً نازک ہوتا ہے اور اس میں مصنّف سے ہر جگہ اتفاق رائے ممکن نہیں لیکن مصنّف نے ایسا مقام بہت کم چھوڑا ہے جس سے اختلاف کیا جا سکتا ہو۔ ان کا ادبی ذوق نکھرا ہوا ہے۔ زبان سلیس اور اسلوب معتدل اور متوازن ہے، اس لیے یہ کتاب ادبی حلقے میں پسند کی جائے گی۔ (کلیم صفات اصلاحی)

ڈاکٹر وسیم احمد فراہی، ڈاکٹر عبدالرزاق الحافظ، اختر مسلمی شخصیت اور فن، صفحات ۳۶۰، البلاغ پبلیکیشنز، نئی دہلی، ۲۰۲۵ء، قیمت: ۶۰۰ روپے۔

موج صبا، موج نسیم اور جام و سنداں کے نام سے شاعری کا کل سرمایہ کمیت کے لحاظ سے بہ ظاہر کسی امتیاز و انفرایت پر مشتمل ایسا کارنامہ نہیں جس کے تجزیہ و جائزہ کے لیے علمی سیمینار کا

انعقاد کیا جائے لیکن جب اقبال سہیل جیسے عظیم المرتبت شاعر کے اداشناس ورمز آشناشاگرد اختر مسلمی ہوں اور کلام فنی وفکری لحاظ سے اعلیٰ ترمعیار کاحامل اورادبی وشعری معراج پر فائز ہو توبلاشبہ حق ہے کہ ان بکھرے ہوئے پھولوں کی عطربیزی کے لیے سخن شناسوں کی محفل منعقد کی جائے،اس صدائے دل دردمند کی بازگشت سنی جائے، شعورذات کے ساتھ شعور معاشرہ اور آئندہ شناسی کے حامل ان کے اشعار کا تجزیہ اورصحیح معنوں میں اس کی قدر وقیمت متعین کی جائے۔ خصوصاً جب اختر مسلمی نے ترقی پسند تحریک، جدیدیت و مابعد جدیت کی آندھی میں اسلامی اقداروروایات کے چراغ کو بجھنے نہ دیاہواور روایتی اور کلاسیکل شاعری کی آبرواور غزلوں میں پاکیزہ جذبات اور فن کے تقدس کی مدت العمر حفاظت کی ہو۔

زیرنظرکتاب اختر مسلمی: شخصیت اور فن کے موضوع پر ۲۰۱۷ء میں منعقدہ قومی سیمینار میں پیش کیے گئے کل ۲۸ مقالات کا مجموعہ ہے۔ حرفے چند، تعارفی کلمات اور کلیدی خطبہ اورآخر میں ڈاکٹر ناطق اعظمی کا قصیدہ اورڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی کا منظوم تاثر اس سے الگ ہیں۔ کلیدی خطبہ مشہور مصنّف ومفسر اور ادیب وشاعر پروفیسر الطاف احمد اعظمی مرحوم کے قلم سے ہے جس میں انہوں نے اختر مسلمی صاحب کے شاعرانہ، بالخصوص ان کے متغزلانہ اوصاف وخصوصیات کا فنی تجزیہ کرتے ہوئے یہ رائے دی ہے کہ بلاشبہ ان کی غزلیہ شاعری فکری وفنی دونوں اعتبار سے لائق مطالعہ ہے۔ پروفیسر صاحب نے یہ بھی لکھاہے کہ ”اختر مسلمی کی شاعری میں تصوف کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا“،جب کہ مولانا قمرالزماں مبارکپوری اوربعض دوسرے مقالہ نگاروں نے ان کے اشعار میں صوفیانہ تاثرات کی نشاندہی کی ہے۔ان کی غزلیہ شاعری کے مفصل جائزے میں مولانامبارکپوری رقمطراز ہیں:”اختر مسلمی نےحسن وعشق کی روایت کا رشتہ تصوف کی حسیت سے جوڑاہے۔ان کے شعر کی لطافت واشاریت اور نزاکت ونشتریت میں متصوفانہ شعور کی لہریں موجود ہیں“۔ پروفیسر احمد محفوظ، مولانا قمرالزماں مبارکپوری، مولانا عمیرالصدیق ندوی،ڈاکٹر شکیل احمد، ایازاحمد اعظمی اور دلشادحسین اصلاحی نے ان کے غزلیہ اوصاف وکمالات کااحاطہ کیاہے۔ان ممتاز مقالہ نگاروں کے عنوانوں میں مماثلت کے باوجود ان کااپناامتیازباقی ہے۔پروفیسر ابوسفیان اصلاحی نے کلیات اختر مسلمی کے چند امتیازات دکھائے ہیں۔ ڈاکٹر آصف زہری نے علی گڑھ، دیوبند اور اصلاح کے ترانوں کا تقابلی مگر ناقدانہ مطالعہ کیاہے۔بدر جمال اصلاحی نے حمدیہ اور مولانامحمد عمر اسلم اصلاحی نے ان کے اصناف شاعری سے بحث کی ہے۔ڈاکٹر عمیرمنظر نے

اختر صاحب کی نغز گوئی کے خصائص تلاش کیے ہیں، ڈاکٹر شفقت اعظمی اور ڈاکٹر فیاض احمد علیگ نے اختر صاحب کے فکر وفن کے موضوع پر عمدہ اور جامع گفتگو کی ہے۔ بعض مقالات میں بحیثیت مجموعی ان کی کل شعری کائنات، شعری جہات، کچھ یادیں، کچھ تاثرات، اردو شاعری میں ان کے مقام، ان کے کلام میں موضوعاتی تنوع، تقسیم ہند کا درد اور ہندوستان میں جدید شعری منظر نامہ پر اختر مسلمی کی حیثیت کا تعین کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عرفات ظفر نے ان کے چند مضامین کا مجملاً تعارف کرا کے نثر کے میدان میں ان کی خدمات کے اس خلا کو پر کیا ہے۔

مقالات میں تنوع اور رنگا رنگی ہے اور ان کی شاعری، شخصیت اور فن کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا گیا ہے لیکن ان کے فنی و فکری احتساب میں اکثر مقالات میں توصیفی رنگ نمایاں ہے۔ اختر صاحب استاد شاعر اور اچھے ناظم مشاعرہ بھی تھے۔ ان کی ان دونوں حیثیتوں پر بھی الگ سے مقالہ ہونا چاہیے تھا۔ بہر حال دیر ہی سے سہی سنجیدہ اور مفید مقالات کا یہ مرقع سوانحی ادب میں یقیناً اضافہ ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت اختر صاحب کو خراج عقیدت کے ساتھ ساتھ شعر وادب کی قابل قدر خدمت ہے۔ (ک، ص اصلاحی)

فتاویٰ دارالعلوم وقف دیوبند (جلد سوم تا نہم)، ترتیب: لجنۃ ترتیب الفتاوی، زیر نگرانی: ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی بن مولانا محمد سفیان قاسمی مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند، ناشر: حجۃ الاسلام اکیڈمی، دارالعلوم وقف دیوبند، ۲۰۲۱ء تا ۲۰۲۵ء، قیمت: درج نہیں، موبائل نمبر: ۹۸۹۷۰۷۶۷۲۶

ان مجموعہائے فتاوی کی مختلف جلدیں الگ الگ اوقات میں شائع ہوئی ہیں۔ ان جلدوں کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے: جلد سوم میں بقیہ باب الانجاس، باب الوضوء، باب الغسل والتیمم، باب الحیض والنفاس والمعذورین، جلد چہارم تا جلد ہشتم کتاب الصلاۃ پر مشتمل ہے۔ ان میں نماز سے متعلق بہت سے ذیلی عناوین قائم کیے گئے ہیں۔ اور جلد نہم کتاب الزکوۃ پر مشتمل ہے۔

ان جلدوں کے آخر میں مصادرِ کتب میں قرآن مجید، تفسیر، اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، تاریخ وسیر اور لغات شامل ہیں۔ فقہی کتابوں میں بدایۃ المجتہد از ابن رشد، اور فقہ السنۃ از السید سابق شامل نہیں ہے جب کہ بہشتی زیور اور بہار شریعت جیسی کتابیں بھی "مراجع کتب" میں شامل ہیں۔

کچھ مندرجہ ذیل نمونوں سے فتاویٰ دارالعلوم وقف کے علمی پایہ کا اندازہ ہو سکے گا:

سوال: امامت کا زیادہ حق دار کون ہے؟ اس کا جواب ان الفاظ میں دیا گیا ہے:

امامت کے لیے مقدم اور زیادہ حق دار وہ ہے جو قرآن کریم، سنت رسول اللہ ﷺ اور نماز کے مسائل سے زیادہ واقفیت رکھتا ہو، قرآن کریم تجوید کے ساتھ اچھے انداز پر پڑھتا ہو اور تقویٰ وطہارت کا زیادہ پابند ہو، لہٰذا مذکورہ صورت میں جو عالم ایسا ہو کہ اس میں مذکورہ اوصاف زیادہ بہتر انداز میں پائے جاتے ہوں وہ امامت کا زیادہ حق دار[1] ہے[2]۔

اس ضمن میں یہ عام غلطی اکثر جگہوں پر دیکھنے کو مل رہی ہے کہ حافظ قرآن کو، نماز کے اہم مسائل سے کم واقفیت رکھنے کے باوجود ایک عالم پر امامت میں فوقیت دی جاتی ہے، جب کہ محقق علماء کے نزدیک مذکورہ بالا حدیث کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کو گہرائی سے سمجھنے والا ہو۔

ایک استفتاء یہ قائم کیا گیا ہے کہ جمعہ کے شرائط کیا ہیں؟ اس کا جواب یوں دیا گیا ہے:

جمعہ کی سات شرطیں فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں: (۱) مصر یعنی شہر یا بڑی آبادی کا ہونا (۲) سلطان (۳) ظہر کا وقت ہونا (۴) خطبہ کا ہونا (۵) خطبہ کا جمعہ سے پہلے ہونا (۶) جماعت (۷) اذنِ عام کا ہونا۔ عیدین میں بھی وہی شرطیں جو جمعہ میں ہیں سوائے سلطان اور خطبہ کے، لیکن یہاں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اقامت جمعہ کے لیے بنیادی شرط بڑی آبادی کا ہونا ہے، ایک ایسی آبادی جہاں ضروریات کی تمام چیزیں ملتی ہوں۔ اہل علم نے تین ہزار یا اس کے آس پاس کی آبادی کو بڑی آبادی میں شمار کیا ہے، اتنی بڑی آبادی میں نماز جمعہ قائم کی جاسکتی ہے[3]۔

جمعہ کے پہلے خطبہ کو اردو میں دینا۔ اس سلسلے میں ایک استفتاء کا جواب دیتے ہوئے ہوئے لکھا گیا ہے:

''...... خطبہ کے دوران عربی زبان کے علاوہ اردو وغیرہ میں تقریر مکروہ ہے۔ تقریر غیر عربی میں کرنی ہو تو خطبہ سے پہلے مادری زبان میں تقریر کی جائے اور اس کے بعد خطبہ صرف عربی زبان میں دیا جائے''۔[4]

مذکورہ جواب محل نظر معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ مشہور اصول فقہ ہے: ''الضرورات تبیح المحظورات''۔ اس لیے اس فتویٰ میں حالات کے تحت وسعت ذہنی لازمی ہے۔ اس کے لیے

---

[1] الاولیٰ بالامامۃ أعلمھم بأحکام الصلاۃ ---الفتاویٰ الھندیۃ، ج۱، الباب الخامس فی الامامۃ فی المطبع الاحمدی بدھلی ۱۲۷۸ھ، ص۳۰

[2] فتاویٰ دارالعلوم وقف دیوبند، جلد پنجم، ص۱۰۱

[3] حوالہ سابق، جلد۸، ص۶۶-۶۷

[4] حوالہ سابق ص۱۶۵-۱۶۶

فتاویٰ دارالعلوم وقف میں جس طرح قدیم مصادر و مراجع کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ایسے ہی جدید کتب فقہ سے استفادہ بھی ناگزیر تھا کیوں کہ آج حالات کافی بدل چکے ہیں۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی و صدر مسلم پرسنل لا بورڈ) نے "غیر عربی زبان میں خطبہ" کے متعلق اپنی کتاب "جدید فقہی مسائل جلد اول" میں تفصیل سے لکھا ہے۔ ان کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> راقم الحروف کا خیال ہے کہ عربی زبان میں خطبہ کی رائے راجح اور اکثر سلف صالحینؒ کے مسلک کے مطابق ہے اور موعظت و تذکیر کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے خطبہ سے پہلے مقامی زبان میں وعظ و تقریر کے ذریعے اس مقصد کو حاصل کیا جاسکتا ہے، البتہ اردو یا غیر عربی زبان میں خطبہ کو بدعت اور کراہت سے موسوم کرنا اور اس معاملہ میں شدت برتنا مناسب نہیں ہے۔

مولانا رحمانی نے اسلامک فقہ اکیڈمی (رابطہ عالم اسلامی جدہ) کے پانچویں سمینار کے منعقدہ ۸ تا ۱۶/ ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ کے حوالے سے لکھا ہے:

> معتدل اور قابل قبول رائے یہ ہے کہ جن ممالک کی زبان عربی نہ ہو وہاں عربی زبان ہی میں جمعہ و عیدین کے خطبے دینا شرط نہیں ہے، البتہ بہتر ہے کہ خطبہ کا تمہیدی حصہ اور خطبہ میں آنے والی آیات قرآنی عربی زبان میں ہوں..... (۵)

اسی ضمن علامہ سید سلیمان ندویؒ نے بہت پہلے کہا تھا:

> ..... جمعہ کے خطبوں کی اصلاح بھی اشد ضروری ہے۔ اہل حدیث اصحاب اور بہت سے علماء نے تو اردو زبان میں خطبہ دینے کے جواز کو تسلیم کر لیا ہے، تاہم اب بھی بہت سے علماء کو صرف اردو زبان میں خطبہ دینے میں تأمل ہے۔ اگر اتنا بھی تسلیم کر لیا جائے کہ عربی کے ساتھ ساتھ اردو میں دینا جائز ہے، تو بہت کچھ اصلاح ہو سکتی ہے، کسی اختلافی مسئلہ کو چھیڑنے کا جرم عائد نہ کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ غیر مجوزین کے پاس سوائے عمل سلف کے غیر عربی زبان میں خطبہ کے عدم جواز کی کوئی دلیل نہیں۔ (۶)

سید سلیمان ندوی نے عمل سلف کو دلیل ماننے والوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اس زمانے میں عربی زبان میں خطبہ ہوتا تھا، وہ زبانی پڑھا جاتا تھا، کسی کتاب میں دیکھ کر نہیں پڑھا جاتا تھا۔ اس کی صورت تلاوت اور قرأت کی نہ تھی بلکہ مختصر زبانی تقریر کی ہوتی تھی۔ اس میں آیات

---

(۵) جدید فقہی مسائل جلد اول، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، ۱۹۹۸ء، ص ۱۶۵-۱۶۶

(۶) سید سلیمان ندوی، خطبۂ صدارت اجلاس ہفتم جمعیۃ العلماء کلکتہ، منعقدہ ۱۱ تا ۱۴ مارچ ۱۹۲۶، ص ۵۹-۶۰

واحادیث کے التزام کے ساتھ مسائل حاضرہ و متجددہ پر مسلمانوں کی فہمائش ہوتی تھی۔ ایک ہی خطبہ کسی کا لکھا یا رٹا ہوا صدیوں تک نہیں پڑھا گیا.....اس میں تغنی نہیں ہوتی تھی، اور مقفیٰ و مسجع بے معنی عبارت بھی نہیں ہوتی تھی"۔[۷]

زکوۃ کے مسئلے میں تملیک، اور حیلۂ تملیک کے بارے میں آج افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ اس کے متعلق مفتی سعید احمد پالن پوریؒ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ تملیک ایک ڈھونگ ہے۔ فتاوی دارالعلوم وقف جلد نہم میں تملیک کے ایک استفتاء کے جواب میں یہ فتویٰ دیا گیا ہے:

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا (إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ)[۸] اس حکم خداوندی سے جمہور علماء نے یہ حکم نکالا ہے کہ زکوۃ اور صدقات واجبہ کے لیے تملیک فقیر وغریب ضروری ہے اس لیے جس صورت میں تملیک نہ پائی جائے زکوٰۃ کی ادائیگی شرعاً نہ ہوگی، پس صورت مسئولہ میں تعمیر مدرسہ میں براہ راست زکوہ کی رقم خرچ کرنے سے زکوۃ ادا نہیں ہوگی۔ البتہ تملیک غریب کے بعد اگر مدرسہ کی تعمیر میں یہ رقم لگادی تو اس طرح زکوۃ کی ادائیگی بھی ہوجائے گی اور مدرسہ کی تعمیری ضروریات بھی پوری ہوجائیں گی۔

آپ کی تحریر کے مطابق عبد اللہ بن باز نے جو براہ راست زکوۃ کی رقم تعمیر مدرسہ میں جائز لکھا ہے اس کے جواز کی دلیل انہیں سے معلوم کرنی چاہیئے، ہماری نظر میں نہیں ہے۔ البتہ "البیّنۃ علی المدعی – الحدیث" کے پیش نظر ان سے دلیل جواز کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔[۹]

سورۃ التوبۃ آیت: ۶۰ مکمل درج ذیل ہے:

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ

آپ کی تحریر کے مطابق عبد اللہ بن باز نے جو براہ راست زکوۃ کی رقم تعمیر مدرسہ میں جائز لکھا ہے اس کے جواز کی دلیل انہیں سے معلوم کرنی چاہیئے۔ یہ کون سا علمی انداز ہے؟ عبد اللہ بن بازؒ کے پیش نظر غالباً اس مذکورہ آیت کا ٹکڑا رہا ہوگا۔ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ۔ (فضل الرحمن اصلاحی)

---

[۷] حوالہ سابق، ص ۶۰

[۸] اس آیت (التوبۃ: ۶۰) کا جزء "فی سبیل اللہ" (اور اللہ کے راستے میں) بھی ہے جو بہت وسیع ہے اور اس میں دین وملت کی فلاح وبہبود و تقویت کی تمام مدیں آتی ہیں لیکن مفتیان کو یہ نظر نہیں آتیں (مدیر)

[۹] فتاوی دار العلوم جلد ۹، ص ۲۰۶-۲۰۷

ادبیات

غزل

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی
نعمانی منزل، نزد ابو ہریرہ مسجد۔ ہمدرد نگر۔بی، جمال پور، علی گڑھ

دل و نظر میں جنگ ہے خرد کا رنگ بھنگ ہے
ہے بات بس پسند کی، وہ پھول ہے کہ سنگ ہے

وہ اس کے عارض حسیں، وہ اس کی چشم سرمگیں
وہ نغمہ بار گفتگو کہ جیسے جلترنگ ہے

وہ دلبری وہ دلکشی نہ گل میں ہے نہ لالہ میں
جو رنگ لے اپنے رنگ میں وہ بس اسی کا رنگ ہے

لطافتوں کی کان وہ ، نزاکتوں کی جان وہ
مچلتی ایک ایک ادا، پھڑکتا انگ انگ ہے

محبتوں کی رہبری ، عداوتوں کی ہمسری
یہ کون سا مزاج ہے کہ موم ہے نہ سنگ ہے

ہیں اس کی بات بات میں اشارے دور، دور کے
اگرچہ دیکھنے میں وہ بہت ہی شوخ و شنگ ہے

نگاہِ حسن یہ بتا نشہ کہاں سے آگیا
کہ آس پاس تو کہیں نہ بادہ ہے ، نہ بنگ ہے

صفائی ڈھونڈتے ہو تم ، کہاں دیارِ غرب میں
چمن تو ہند ہی میں ہے، یہیں پہ رودِ گنگ ہے

عجیب دور ہے ، لگا رہا ہے ہم پہ تہمتیں
جو رات دن جہان کے مجرموں کے سنگ ہے

فضا میں زہر گھول کر، نہ کر بلند اپنا سر
ترے لیے بھی پر خطر، یہ نفرتوں کی جنگ ہے

وہ جن کے نام ایپسٹین فائلوں میں درج ہیں
انہیں کے ظلم و جور سے جہاں کا امن بھنگ ہے

لگا رکھی ہے جھوٹ کی دکان امیر شہر نے
نہ خوف ہے اسے کوئی ، نہ فکرِ نام و ننگ ہے

کہیں بھی برّ و بحر میں نہ امن ہے نہ عافیت
اِدھر ہے اژدہا کا پھن، اُدھر فمِ نہنگ ہے

ہے بات وقت وقت کی، وگرنہ میرے ہم وطن!
نہیں ہیں ہم بھی موم کے، اگر حریف سنگ ہے

ستم گروں کو پھر بھی ہم سے خوف ہے رئیس کیوں
تبر ہے اپنے ہاتھ میں نہ تیغ اور تفنگ ہے

معارف کی ڈاک

عربی ادب میں سیرتِ رسولِ کریمؐ

محترم، میں نہایت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مارچ کا شمارہ عطا فرمایا۔ اس میں عربی ادب میں سیرتِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ناول نگاری کے موضوع پر ایک بہت دلچسپ مضمون شامل ہے۔ البتہ، سچ پوچھیے تو اس مضمون میں گہرے تجزیے کی کمی محسوس ہوئی، جو اس کی اہمیت کو مزید اجاگر کر سکتی تھی۔ تاہم، اس کی خوبی یہ ہے کہ اس طرح ایک اہم موضوع کو زیرِ بحث لایا گیا ہے، جو یقیناً قابلِ ستائش ہے۔

اب وقت کا تقاضا ہے کہ اردو ادب میں بھی سیرتِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ناول نگاری کا ایک جامع اور باریک بین جائزہ انہی صفحات پر پیش کیا جائے۔ یہ جائزہ نہ صرف علمی بیداری کو فروغ دے گا بلکہ موضوع کی حساسیت کو بھی پیشِ نظر رکھے گا۔

سچ تو یہ ہے کہ سیرتِ پاک کو ناول کی شکل میں پیش کرنا مناسب نہیں، کیونکہ ناول نگاری میں ڈرامائی عناصر، مبالغہ آمیزی، اور کرداروں کی داخلی نفسیات کی عکاسی لازمی طور پر افسانوی رنگ اختیار کرتی ہے۔ اس صنف میں تخیل کی پرواز اور 'گپ شپ' کا عنصر بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتا ہے، جو حقیقت کو افسانے کی چادر اوڑھا دیتا ہے۔ شخصیت نگاری کی یہ تکنیک تب ضروری ہوتی ہے جب پیش نظر کردار میں کسی خامی یا کمزوری کو تخیل کے زور سے بھرا جائے، مگر ایسی چیز پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن میں تاثر محض ایک 'افسانوی کہانی' کا بنتا ہے۔ اگر سیرتِ پاک پر مبنی ناول پڑھنے کے بعد قاری کے دل میں ایسا کوئی تاثر یا وہم بھی پیدا ہو تو یہ ایک سنگین نقصان ہے، جسے نرم سے نرم لفظوں میں بھی 'گستاخانہ احساس' کہا جا سکتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم سیرتِ پاک کو اس افسانوی کثافت سے بچا سکتے ہیں؟ یقیناً، کسی کو روکا تو نہیں جا سکتا، مگر کم از کم رکنے کا احساس اور احتیاط کی تلقین تو کی جا سکتی ہے۔ یہ ایک بڑی نیکی ہو گی، جو ادبی اور مذہبی دونوں اعتبار سے ہماری ذمہ داری ہے۔

آپ کی توجہ اور غور و فکر کا منتظر،

سلیم منصور خالد، لاہور
123ubm@gmail.com

معارف: معارف کے ایک مضمون کے بارے میں آپ کی تحسین کا شکریہ۔ کوشش ہو گی کہ کوئی مل سکے جو اردو میں بھی سیرت پر اس پہلو سے جو کام ہوا ہے، اس کا تجزیہ کرے۔ ادب کی نئی نئی صنفیں پیدا ہو رہی ہیں اور اب تو انٹرنٹ پر طرح طرح کے زاویوں سے رسول پاکؐ اور اسلامی تاریخ کو پیش کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ فلمیں بھی حضور پاکؐ اور عمومی اسلامی تاریخ اور اہم اسلامی شخصیات پر بن رہی ہیں بلکہ برسوں سے یہ سلسلہ جاری ہے جیسے سنہ ۱۹۷۶ میں ریلیز ہونے والی مصطفی العقاد کی معرکۃ الآرا فلم "دی میسیج"۔ اس قسم کی کاوشوں کو روکا نہیں جا سکتا ہے لیکن اگر ذمے دار اہل ایمان یہ کام انجام دیں تو اس کا فائدہ بھی اس زمانے میں بہت ہو گا کیونکہ لوگ اب پڑھنے سے زیادہ مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں۔ (ظفر الاسلام خان)

سلیم منصور خالد: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔ جی ہاں استاد گرامی روکا نہیں جا سکتا، مگر ذمہ دارانہ نقد، افراط و تفریط پر روک لگا سکتا یا پھر لکھنے والے کو محتاط بنا سکتا ہے، بنیادی طور پر یہ پہلو نمایاں کرتے رہنا ہو گا۔ ناول، افسانے اور ڈرامے میں بنیادی چیز اس کے کرداروں کی داخلی شخصیت (یعنی نفسیاتی زیر و بم) کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ یہی ہے نازک دوراہا!

مکتوبات سلیمانی

بنام

مولانا عبد الماجد دریابادیؒ

اردو کے مکتوباتی ادب میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ان خطوط کو خاص اہمیت حاصل ہے جو وقت کے ممتاز صاحب اسلوب ادیب و انشا پرداز، مدیر صدق اور مفسر قرآن مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کے نام لکھے گئے۔ اور برسوں پہلے دو جلدوں میں یہ مکتوبات سلیمانی کے نام سے شائع ہوئے تھے اور اب گویا نایاب تھے اور ان کے طبع جدید کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جس کو الحمد للہ دار المصنّفین نے محسوس کیا اور اب ایک ہی جلد میں نہایت خوبصورت کتابت و طباعت سے آراستہ کر کے شائع کر دیا ہے۔ ادب عالیہ کے شائقین کے لیے یہ مجموعۂ مکتوبات، نہایت مفید، دلچسپ اور بصیرت افروز معلومات کا بھی مجموعہ ہے۔

قیمت: ۵۰۰ روپے صفحات: ۴۸۲

رسید کتب موصولہ

مولانا جلیل احسن ندوی، مولانا نعیم الدین اصلاحی (ترتیب و تعلیق)، تدبر قرآن پر ایک نظر: ادارۂ علمیہ، جامعۃ الفلاح، بلریاگنج، اعظم گڑھ، صفحات: ۲۲۴، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۲۲۵ روپے، موبائل نمبر: ۹۲۱۲۱۱۷۵۵۹

صابر جہان آبادی، تلمیذ سخن : کتب خانہ انجمنِ ترقی اردو، جامع مسجد، دہلی، صفحات: ۱۵۲، سالِ اشاعت: ۲۰۲۶ء، قیمت: ۲۵۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۸۶۸۶۳۹۳۱۹

وارث ریاضی، چند دن دیار حرم میں: خانقاہِ مجیبیہ، پھلواری شریف، پٹنہ، صفحات: ۱۸۴، سالِ اشاعت: ۲۰۲۶ء، قیمت: درج نہیں، موبائل نمبر: ۸۲۲۸۹۰۲۵۴۸

پروفیسر مجید بیدار، دکنی ادب کی تخلیقی خصوصیات: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی، صفحات: ۴۰۷، سالِ اشاعت: ۲۰۲۱ء، قیمت: ۶۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۴۴۱۶۹۷۰۷۲

ڈاکٹر الیاس الاعظمی، سیرت نگاران اعظم گڑھ (اور ان کی تصانیف سیرتؐ): مکتبہ الفہیم، ریحان مارکیٹ، دھوبیا املی روڈ، صدر چوک، مئوناتھ بھنجن، صفحات: ۲۲۷، سالِ اشاعت: ۲۰۲۶ء، قیمت: ۵۵۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۳۳۶۰۱۰۲۲۴

حافظ عزیز الدین مرادآبادی، حافظ شاہد رفیق (تدوین جدید)، شاہ محمد اسماعیل دہلویؒ کی تصانیف پر اشکالات کا ازالہ: دارالفہیم پبلی کیشنز، مئوناتھ بھنجن، صفحات: ۱۶۰، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۲۷۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۹۳۶۰۷۲۸۸۶

محمد لقمان، شعراءِ ندوہ: مکتبہ احسان، لکھنؤ، صفحات: ۱۰۴، سالِ اشاعت: ۲۰۲۶ء، قیمت: ۱۵۰ روپے، موبائل نمبر: درج نہیں۔

مصطفیٰ اکیول، جلیس اختر نصیری (مترجم)، مسلم اذہان کی تشکیل نو: خسرو فاؤنڈیشن، ڈیفنس کالونی، نئی دہلی، صفحات: ۲۴۴، سالِ اشاعت: ۲۰۲۶ء، قیمت: ۶۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۸۸۹۱۱۴۸۲۷۸

آسیہ بی بی، مولانا شبلی نعمانی پر مولانا عبد الرؤف داناپوری کے نقد کا جائزہ: دارالفہیم پبلی کیشنز، مئوناتھ بھنجن، صفحات: ۱۶۲، سالِ اشاعت: ۲۰۲۶ء، قیمت: ۴۹۵ روپے، موبائل نمبر: ۹۹۳۶۰۷۲۸۸۶

مکتالال، یادیں جگن ناتھ آزاد کی (ہندی): مکتالال، ساؤتھ ایکسٹنشن، نئی دہلی، صفحات: ۳۹۲، سالِ اشاعت: ۲۰۲۶ء، قیمت: ۴۲۵ روپے، موبائل نمبر: ۹۸۱۰۱۲۹۷۴۹

تصانیف سید صباح الدین عبدالرحمٰن ؒ

اسمائے کتب	قیمت	اسمائے کتب	قیمت
حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ	20/-	ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں	60/-
حضرت ابوالحسن ہجویری	20/-	ظہیر الدین محمد بابر (ہندو مورخین کی نظر میں)	300/-
مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر	70/-	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (اول)	150/-
محمد علی کی یاد میں	250/-	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (دوم)	100/-
بزم رفتگاں اول	240/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
بزم رفتگاں دوم	250/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (اول)	75/-
صوفی امیر خسرو	150/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
اسلام میں مذہبی رواداری	250/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (دوم)	100/-
بزم تیموریہ اول	400/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
بزم تیموریہ دوم	220/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (سوم)	150/-
بزم تیموریہ سوم	260/-	مغل بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان	
بزم صوفیہ	350/-	سے محبت و شیفتگی کے جذبات	150/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک	240/-	مقالات سلیمان (اول)	400/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام	425/-	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (اول)	350/-
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے	250/-	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (دوم)	150/-
بزم مملوکیہ	250/-	سید سلیمان ندوی کی دینی وعلمی خدمات پر ایک نظر	60/-
ہندوستان کے سلاطین علما اور مشائخ پر ایک نظر	250/-	مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف کا مطالعہ	150/-
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے		عالم گیر (انگریزی)	100/-
تمدنی کارنامے	200/-	صلیبی جنگ	25/-

Total Pages: 84 (Including Cover Page)

APR 2026 Vol- 213(4) ISSN 0974-7346 Ma'arif(Urdu)-Print

RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP- 43/2026-28

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)
Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی نئی مطبوعات

حضور اکرم ﷺ کی مکی زندگی حصہ اول	مرتبہ: مولانا کلیم صفات اصلاحی	400/-
حضور اکرم ﷺ کی مکی زندگی حصہ دوم	مرتبہ: مولانا کلیم صفات اصلاحی	400/-
مکتوبات سلیمانی	مولانا عبدالماجد دریابادی	500/-
بیان سہیل	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	400/-
محمد اقبال: فہم خودی و بےخودی	خالد ندیم	300/-
شبلی شناسی کی نئی جہات	پروفیسر اشتیاق احمد ظلی	300/-

تاریخ ساز ادارے کے معاون خاص بنئے

برصغیر کے قدیم ترین علمی اور تحقیقی ادارہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ کو خودکفیل بنائیے۔ سنہ ۱۹۱۴ سے قائم یہ وہی ادارہ ہے جس نے علامہ شبلی نعمانی کی شہرہ آفاق تصنیف سیرت النبی سمیت ۲۸۰ بیش قیمت علمی اور تحقیقی کتابیں شائع کی ہیں۔ آج جبکہ تاریخ کے نام پہ مسلمانان ہند پر یلغار ہو رہی ہے، اس ادارے کو تقویت دینا اور خودکفیل بنانا پوری ملت کا فرض ہے۔ کم از کم پانچ ہزار روپیے سالانہ تعاون فرمائیں۔ اکاؤنٹ کی تفصیل اور QR کوڈ حاضر ہے۔

A/C: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH
A/C No: 0504010100032752
Bank Name: PUNJAB NATIONAL BANK
Branch: HEERPATTI - AZAMGARH (U.P.)
IFSC: PUNB 0476100 - Bank Code: 476100

Darul Musannefin Shibli Academy
Shibli Road, Azamgarh-276001, U.P.
Contact: Dr Fakhrul Islam Azmi, Dy. Director
Mobile: 99352 33940
Email: info@shibliacademy.org [to inform after remittance]
www.shibliacademy.org

Scan and pay with any BHIM UPI
BHIM UPI
G Pay Paytm

تعاون بھیج کر اپنے پورے پتہ کے ساتھ ہمیں ای-میل سے مطلع کریں۔ ڈاکٹر ظفرالاسلام خان (ڈائرکٹر)